Regd. No. 7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری 1985

اس پرچہ میں

اسلام کا سیاسی نظام

(عہد فاروقؓ میں)

سعید

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 4 روپے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

بدل اشتراک	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان /- ۴۸ روپے غیر ممالک / ۹۸ روپے	خط و کتابت ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	۴ چار روپے
جلد ۳۸	فروری ۱۹۸۵ء	شمارہ ۲

فہرست

۱- لمعات ---------------- ۲

۲- اسلامی مملکت کا نظام عدل (پرویز صاحب) -------- ۷

۳- اسلام کا سیاسی نظام (عہد فاروقی میں) -------- ۳۰

ایڈیٹر محمد خلیل : ناشر شیخ عبدالحمید : مقام اشاعت ، ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور - مطبوعہ : اشرف پرنٹنگ پریس ۹ ، ایبک روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اس انسان کی جو سب سے زیادہ ہوشمند، لطیف الطبع حیوان اور سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لئے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دور سے بھی اچھی حکومت کہا جا سکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں، بہت سی ایسی جو فی الواقع محیر العقول ہیں اور بہت سی ایسی جو بڑی جرأت آزما تھیں۔ لیکن جب ان کی عملی تنفیذ کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور اربابِ حکومت عوام کے خادم ہیں۔ لیکن درحقیقت حکومت کا فریضہ عوام کی خدمت نہیں، بلکہ سلب و نہب ہو جاتا ہے۔

یہ الفاظ عہدِ قدیم کے کسی دانشور کے نہیں، جو اس نتیجہ پر اس زمانے میں پہنچا ہو جب انسان نے ہنوز محض دو ایک اسالیبِ حکومت کا تجربہ کیا تھا اور اسے ان نظامہائے مملکت کا علم نہیں تھا جنہیں انسانوں نے بعد میں وضع اور اختیار کیا۔ اگر اس کے سامنے بعد کے وضع کردہ نظام ہوتے تو وہ اس نتیجہ پر نہ پہنچتا۔ یہ الفاظ خود ہمارے زمانے کے ایک بہت بڑے سیاسی مفکر (H. J. MENCKEN) کے ہیں جسے انہوں نے عہدِ قدیم سے لے کر عصرِ حاضر تک کے تمام نظامہائے حکومت کا جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے۔ انسان ان تمام صدیوں کی استخواں شکن تگ و تاز، مہیب خونریزیوں اور وحشت خیز آتش فشانیوں کے بعد اپنے مختلف تجارب کو ناکام قرار دیتا ہوا جس آخری نظام تک پہنچا ہے وہ مغرب کا جمہوری نظام ہے۔ اس پہ یورپ کو بڑا ناز تھا اور اب بھی بیشتر ممالک میں اسے بڑے فخر سے پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن انسان کی اس آخری کامیابی کے متعلق بھی پروفیسر مینکن لکھتا ہے کہ:۔

ان مختلف اسالیبِ حکومت میں سب سے زیادہ ناکام نظام جمہوریت رہا ہے۔ جمہوری نظام کے اربابِ حل و عقد خوب جانتے ہیں کہ حکومت کی بنیاد معقولیت پر ہونی چاہیئے

لیکن ان کا جذبۂ محرکہ کبھی معقولیت پسند نہیں ہوتا۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ جو قوت بھی باہر سے زیادہ دباؤ ڈال سکے اس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ اس ہتھکنڈے سے یہ لوگ اُن عناصر کے بل بوتے پر جو فی الحقیقت عوام کے دشمن ہوتے ہیں لامتناہی عرصے تک برسر اقتدار رہتے ہیں۔

ہم مغرب کے نظام جمہوریت کے خلاف خود وہاں کے ارباب فکر و سیاست کی آراء و افکار اس کثرت سے پیش کر چکے ہیں کہ ان کے دہرانے کی یہاں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہم اس مقام پر صرف اتنا بتا دینا کافی سمجھتے ہیں کہ ان ارباب فکر و نظر کے نزدیک اس نظام (یا انسانوں کے وضع کردہ ہر نظام) کی ناکامی کی بنیادی وجہ کیا ہے۔ شہرۂ آفاق کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) کا نامور مصنف بریفو کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے کہ:۔

ایک انسان کا دوسرے انسان پر اقتدار و اختیار (خواہ وہ کسی رنگ میں ہو) استبداد ہے۔ طاقت ہمیشہ کمزور کے حقوق کو غصب کرتا ہے۔ قوت عدل و انصاف کو پامال کر دیتی ہے، اس لئے ظالم و جابر ہوتی ہے۔ یہ انکشاف آج کا نہیں بہت پرانا ہے کہ انسانی اقتدار بنیادی طور پر باطل ہے خواہ یہ کسی کے ہاتھ میں بھی کیوں نہ ہو۔ لارڈ ایکٹن نے ٹھیک کہا تھا کہ قوت انسان کو خراب کر دیتی ہے اور مطلق قوت اسے بالکلیہ تباہ کر دیتی ہے۔ نشۂ اقتدار سے انسان میں معقولیت کے ساتھ سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ قوت کسی رنگ میں ہو اس کے یہی نتائج ہوں گے۔ وہ جاہ و منصب کی ہو یا پنجۂ فولاد کی، دولت و حشمت کی ہو یا محض ذہنی برتری کی، کسی افسر کی ہو یا حاکم کی، کسی پادری کی ہو یا پروہت کی۔ قوت بہر حال قوت ہے اور فساد کی جڑ۔ اس کا لازمی نتیجہ ظلم اور بیداد گری ہوتا ہے۔ اور ان سب میں سب سے زیادہ خراب قوت وہ ہے جو اکثریت، محض اپنی تعداد کے بل بوتے پر، اقلیت کے خلاف استعمال کرتی ہے۔

دور حاضر کے جمہوری نظام میں بعض انسانوں کا دوسرے انسانوں پر یہ اقتدار قانون سازی کے اختیار کی شکل میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ وہ قوانین جنہیں محض اس لئے صحیح اور جائز قرار دیا جاتا ہے کہ انہیں اکثریت نے وضع کیا ہے۔ ان قوانین کو قوت کے زور پر منوایا جاتا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ صحیح انسانیت ساز نظام وہی ہو سکتا ہے جس میں انسانوں کو قانون سازی کے مطلق اختیارات حاصل نہ ہوں۔ لیکن انسانی فکر اس قسم کا کوئی نظام

نہ وضع کر سکتی ہے نہ کر سکتی ہے، نہ کر سکے گی۔ اس قسم کا نظام صرف وحی کی بارگاہ سے مل سکتا ہے۔ وہ وحی جس نے بتایا کہ قوانین سازی کے اصول اور حدود خدا کی طرف سے متعین شدہ ہیں جن میں کوئی انسان، کسی قسم کا رد و بدل نہیں کر سکتا۔ ہر زمانے کے انسان باہمی مشاورت سے یہ طے کریں گے کہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، ہم اپنا نظامِ تمدن کس قسم کا متعین اور متشکل کریں۔ یہ حدود و اصول ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کے اندر رہتے ہوئے جو تمدنی احکام و قوانین وضع کئے جائیں گے ان میں حالات کے تقاضے کے مطابق ردّ و بدل ہوتا رہے گا۔ یہ اصول و حدود قرآنِ کریم کے اندر درج اور محفوظ ہیں۔ ہر دور کے انسان باہمی مشاورت سے، ان حدود کے اندر رہتے ہوئے جزئی قوانین خود وضع کریں گے۔ مشاورت کی مشینری کس قسم کی ہو گی۔ اسے بھی اس نے خود متعین نہیں کیا۔ اسے انسانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ وہ طریق تھا جس کے مطابق اسلام کے صدرِ اوّل میں ایسا نظامِ تمدن قائم ہوا جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان پر کسی قسم کا اقتدار نہیں رکھتا تھا۔ جس میں نہ کوئی حاکم تھا نہ محکوم۔ وہ سب، اصول و اقدارِ خداوندی کے تابع اپنے زمانے کے حالات کے مطابق کامل آزادی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ چشمِ فلک نے اس جیسا دور پھر کبھی نہیں دیکھا۔ مملکتِ پاکستان کا مطالبہ اور حصول پھر سے اُسی قسم کا نظام قائم کرنے کے لئے عمل میں آیا تھا۔ لیکن افسوس کہ ہم نے یہ مقصد اور منتہیٰ فراموش کر دیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب اس مقصد اور منتہیٰ کو فراموش کر دیا تو لامحالہ ہمیں بھی انسانوں کا وضع کردہ نظامِ تمدن ہی اختیار کرنا تھا۔ یہ نظامِ تمدن وہ ہے جسے مغرب کا جمہوری نظام کہا جاتا ہے۔ اس کے برسرِ حق ہونے کی ہمارے پاس ایک ہی دلیل ہے اور وہ یہ کہ یہ نظام اب دنیا میں عام طور پر رائج ہے اور اقوامِ مغرب کا پسندیدہ۔ وا ئے برحالِ ما کہ ہمارے ہاں کے اقامتِ دین کے مدعی بھی اس نظام کی مدح و ستائش میں رطب اللسان ہیں وہ اسے عین مطابقِ اسلام قرار دیتے ہیں۔

اس جمہوری نظام کی مشینری کی ایک شق یہ بھی ہے کہ ایک متعین وقفہ کے بعد ملک میں عام انتخابات کئے جائیں۔ یہ طریقِ انتخاب بجائے خویش مغربی نظامِ جمہوریت کی ناکامی کا بنیادی سبب ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس طرز کے نقائص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔ انتخابات کے سلسلے میں سب سے زیادہ زور اس پر دیا جاتا ہے کہ انتخابات منصفانہ ہونے چاہئیں۔ ان میں دھاندلی نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سے زیادہ مطالبہ کوئی نہیں

کیا جاتا۔ اس بنیادی کمزوری کو آپ ایک مثال سے سمجھئے۔ آپ کے حلقۂ انتخاب کا ایک چھٹا ہوا بدمعاش بطور امیدوار کھڑا ہو جاتا ہے۔ انتخابات بالکل منصفانہ ہوتے ہیں لیکن وہ اس کا انتظام کر لیتا ہے کہ اکاون فیصد ووٹ اس کے حق میں ڈالے جائیں، چنانچہ وہ قاعدے اور قانون کے عین مطابق بغیر کسی دھاندلی کے کامیاب ہو جاتا ہے۔ آپ فرمائیے کہ کیا آپ اسے اپنا نمائندہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔؟ لیکن سوال آپ کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا نہیں، قانون کی رُو سے آپ کو اُسے اپنے حلقہ کا نمائندہ تسلیم کرنا ہوگا۔ اب آگے بڑھئے۔ فرض کیجئے کہ اسمبلی میں ایسے لوگ اکثریت حاصل کر لیتے ہیں جنہیں آپ بطیبِ خاطر اپنا نمائندہ تسلیم نہیں کرتے، لیکن وہ اپنی اپنی مدتِ رکنیت کے دوران جس قدر فیصلے کریں گے، انہیں آپ کو تسلیم کرنا ہوگا۔ خواہ وہ فیصلے کسی قسم کے ہوں۔ ملک کی بڑی سے بڑی عدالت بھی صرف یہ دیکھے گی کہ ان کے یہ فیصلے (یعنی ان کے وضع کردہ قوانین) آئینِ مملکت کی شرائط پوری کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر وہ ان شرائط پر پورے اترتے ہوں تو عدالتِ عالیہ تک کو بھی انہیں مسترد کر دینا تو ایک طرف ان میں کسی قسم کے ردّوبدل کا بھی حق حاصل نہیں ہوگا۔ یعنی ان لوگوں کے فیصلوں کے خلاف آپ کی کوئی اپیل بھی قابلِ قبول قرار نہیں پائے گی۔ یہ ہے موجودہ نظامِ جمہوریت۔ ہم نے اپنے ہاں آئینی طور پر اس نظام کو قبول اور نافذ کر رکھا ہے۔ اس لئے آپ کہیں گے کہ اسے بدلنے کا تو ہمیں حق حاصل نہیں۔ لہٰذا ان حالات میں ہم اس کے مطابق عملدرآمد پر مجبور ہیں۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کو ایک اختیار تو بہر حال حاصل ہے جسے کوئی آئین اور کوئی قانون آپ سے چھین نہیں سکتا۔ یعنی یہ اختیار کہ آپ اس شخص کو ووٹ دیں جس کی صداقت، شرافت، امانت، دیانت اور اہلیت پر آپ کو پورا پورا بھروسہ ہو۔ ایسے شخص کے تولنے اور ماپنے کے لئے قرآنِ کریم نے ایک ایسا پیمانہ عطا کر دیا ہے جو کبھی غلطی نہیں کرتا۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے آپ کے مخالفین نے پوچھا کہ آپ کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے کہ آپ اپنے دعویٰ نبوت میں سچے ہیں تو آپ نے (قرآن کی شہادت کے مطابق) فرمایا کہ، فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۰/۱۶)۔ میں کوئی اجنبی یا نووارد نہیں، میں نے تم میں اس سے پہلے اپنی پوری عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس پر غور کر کے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا۔ اس میں جس تبدیلی کا ٹکڑا بڑا بنیادی ہے۔ جب کوئی شخص کسی منصب کے لئے آگے بڑھنے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنی وضع کو بڑا مقدس بنا لیتا ہے۔ لیکن اس کا صحیح کیریکٹر اس کی اس زمانے کی زندگی سے سامنے آسکتا ہے جب وہ عام آدمیوں کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ بس یہ ہے صحیح پیمانہ۔ جو شخص بطور امیدوار

کھڑا ہو تو آپ یہ دیکھئے کہ اس کی پہلی زندگی کس قسم کی گذری ہے۔ اس سے آپ اس کے کیریکٹر کا اندازہ لگا لیجئے اور اگر وہ صحیح معیار پر پورا اترے تو پھر اس کے حق میں ووٹ دیجئے۔

یہاں تک تو اس امیدوار کے صرف انسان ہونے تک کی بات تھی۔ اگر آپ اُسے اسلام کے معیار پر پرکھنا چاہتے ہیں تو اس سے کہئے کہ وہ اس کا اعلان کرے اگر مجلس قانون ساز میں کوئی معاملہ ایسا پیش آگیا جو قرآن مجید کے خلاف ہو تو میں اس کی اعلانیہ مخالفت کروں گا۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو جن لوگوں نے مجھے ووٹ دیا ہوگا انہیں اس کا حق حاصل ہوگا کہ مجھ سے رکنیت سے مستعفی ہوجانے کا مطالبہ کریں۔ اس اعلان سے وہ شخص مسلمانوں کا نمائندہ کہلا سکے گا۔ آپ اس قسم کے نمائندوں کو اکثریت کے ساتھ اسمبلیوں میں بھیجئے اور پھر دیکھئے کہ ان اسمبلیوں کی ایک ہی مدتِ حیات میں معاشرہ میں کس قدر خوشگوار انقلاب آجاتا ہے۔

جہاں تک تحریکِ طلوعِ اسلام کا تعلق ہے، ہم عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتے۔ نہ ہماری اپنی کوئی سیاسی پارٹی ہے، نہ ہم کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہوتے ہیں۔ اگر بزمِ طلوعِ اسلام کا کوئی رکن کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہونا چاہے تو اسے بزم کی رکنیت سے استعفےٰ دینا پڑتا ہے۔ بزم کا رکن البتہ اپنی ذاتی حیثیت سے آزاد امیدوار کے طور پر اسمبلی کی رکنیت کے لئے کھڑا ہوسکتا ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ اگر اس اسمبلی میں کوئی مسئلہ ایسا سامنے آئے گا جو قرآن مجید کے خلاف ہوگا تو وہ اس کی مخالفت کرے گا۔ انتخابات آخر فروری میں ہوں گے۔ اس دوران میں ظاہر ہے کہ ملک انتخابی سرگرمیوں کے بحران میں مبتلا ہوگا۔ لیکن طلوعِ اسلام کی بزموں کو تاکید کی جاتی ہے کہ وہ کسی ہنگامہ میں حصہ نہ لیں۔ اپنی صوابدید کے مطابق بہتر ین امیدوار کے حق میں ووٹ دیں، اور نہایت ہی خاموشی اور سکون سے، قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے پروگرام پر عمل پیرا رہیں۔ یہ سب ہنگامے رفتہ رفتہ ختم ہوجائیں گے اور آخرالامر سربلندی قرآن ہی کے پیغام کو نصیب ہوگی۔

بسلسلہ معذرت ضمن طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۸۵ء!

محترم پرویز صاحب کی بحالیٔ صحت، کامیاب آپریشن کے بعد بفضلہٖ تعالیٰ مزید تدریجی مراحل سے گذر رہی ہے، لیکن ایک گونہ جسمانی کمزوری اب بھی باقی ہے جو انشاءاللہ چند اور ہفتے تک (PHYSIO-THERAPY) کے ذریعے دور ہوجائیگی۔ لہٰذا قارئین طلوعِ اسلام جن کی طرف سے استفسارات مسلسل موصول ہوتے رہے ہیں، اطمینان رکھیں اور پرویز صاحب کیطرف سے مزید معذرت قبول فرمائیں۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی مملکت کا نظامِ عدل

(قانون کی حکمرانی)

پرویز

وہ غالباً (مشہور مغربی مفکر) لاک تھا جس نے کہا تھا کہ تم مجھے یہ بتا دو کہ فلاں قوم نے اپنی پرستش کے لئے کس قسم کا خدا تجویز کر رکھا ہے، اور میں تمہیں اس قوم کی تہذیب و تمدن کے متعلق سب کچھ بتا دوں گا۔ اس مفکر نے بات بڑی پتے کی کہی ہے۔ "معبود" یا تو ذہن انسانی کا تراشیدہ ہوگا، اور یا اُسے ذہن انسانی نے قابلِ قبول سمجھا ہوگا۔ دونوں صورتوں میں، وہ اس قوم کی ذہنی سطح اور نفسیاتی اُفتاد کا آئینہ دار ہوگا جس نے اسے اپنی پرستش کے لئے اختیار کر رکھا ہوگا۔ اور چونکہ "معبود" کا مقام، قوم کے تصور میں بلند ترین ہوتا ہے، اس لئے اُس قوم کی تہذیب و تمدن کے خط و خال لازماً اُس (معبود) کی خصوصیات سے متاثر ہوں گے۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہ اس کے سانچے میں ڈھلے ہوں گے۔

اگر آپ انسانی تاریخ کا مطالعہ اس نگاہ سے کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ اس دعوے کی صداقت کے لئے بیّن شہادات پیش کرتی ہے۔ آپ اپنے ہمسایہ ملک (ہندوستان) کو دیکھئے۔ ان کے ہاں، بادل، بجلی، بارش، سورج، ہوا، زمین، دریا، درخت، گائے، سب دیوی دیوتا مانے جاتے تھے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ معبود اُس قوم کے ذہن کے تراشیدہ تھے جو زراعت پیشہ تھی۔ فطرت کی جو قوت، کھیتی کے لئے مفید نظر آئی، انہوں نے اس کے چرنوں (قدموں) میں اپنی شردھا (عقیدت) کے پھول نچھاور کر دیئے۔ جو قوت، ضرر رساں ہوئی، اس سے ڈرتے، اس کے سامنے ڈنڈوت بجا لائے (جھک گئے)۔ اس سے آگے بڑھے تو انہوں نے زندگی کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر دیا اور ہر شعبہ کے لئے جداگانہ خدا تجویز کر لیا — برہما، پیدا کرنے والا۔ وشنو، پرورش کرنے والا۔ اور شیوجی، فنا کرنے والا۔ زندگی کی یہی تقسیم ان کے معاشرہ کی بنیاد بن گئی اور انسان، برہمن، کھشتری، ویش، شودر کے ورنوں میں منقسم ہو گیا۔ اس تقسیم کا نتیجہ یہ تھا کہ معاشرتی معاملات میں تمام انسانوں کے لئے ایک جیسا قانون نہیں تھا۔ ایک ہی جرم کی سزا، برہمن، کھشتری، ویش اور شودر کے لئے الگ الگ تھی۔ اگر کوئی اچھوت کسی اُونچی ذات والے کو چھو بھی لے تو وہ موت کی سزا کا مستوجب ہو جاتا تھا لیکن برہمن کسی کو قتل بھی کر ڈالے تو اسے سزائے موت نہیں دی جا سکتی تھی۔ لین دین کے معاملات تک میں یہ حالت تھی کہ اگر برہمن قرض لے تو اس سے ۲۴ فی صد سود لیا جاتا تھا۔ کھشتری سے ۳۶ فی صد۔ ویش سے ۴۸ فی صد اور شودر سے ۶۰ فی صد۔ رگوید میں یہاں تک لکھا ہے کہ

ہندوؤں کے معبود

ورنوں کی تقسیم

> اگر کسی عورت کے پہلے دس غیر برہمن خاوند موجود ہوں اور برہمن اس کا ہاتھ پکڑ لے تو وہی اکیلا اس کا خاوند سمجھا جائے۔ کیونکہ برہمن ہی عورتوں کا مالک یا خاوند ہے نہ کہ کھشتری اور ویش وغیرہ

ورنوں کی یہ تقسیم پیدائشی تھی جس پر کسی کو کچھ اختیار نہیں تھا اور نہ ہی بعد میں کسی حسنِ تدبیر یا نیک عملی سے مٹائی جاسکتی تھی۔ اس کے لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا تھا کہ برہمنوں کو برہما (خدا) نے اپنے سر سے پیدا کیا ہے۔ کھشتریوں کو اپنے بازوؤں سے۔ ویشں کو اپنے پیٹ سے اور شودروں کو اپنے پاؤں سے۔ یہ تفریق برہما نے اپنی مرضی سے کی ہے جس میں کسی کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔

مُستبد حکمران

اس سے ان کے ہاں مستبد حکمرانوں کا تصور وجود میں آیا جس کی وجہ سے، راجہ کو ایشور (خدا) کا اوتار سمجھ لیا گیا۔ "ایشور کا اوتار" سمجھنے کے معنی یہ تھے کہ راجہ کے ہر حکم کی تعمیل بلا چون و چرا کی جائے گی۔ اس سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ اس کے حکم کی علت اور حکمت کیا ہے۔ ہم اس کی اطاعت کیوں کریں، ہم اس کے سامنے کیوں جھکیں۔ اس لئے کہ جس قسم کا آمر مطلق خدا، اسی قسم کا ڈکٹیٹر اس کا اوتار۔

یہودیوں نے اپنے لئے جس "خدا" کو تجویز کیا اس کی تنگ نظری کا یہ عالم تھا کہ وہ تھا ہی بنی اسرائیل کا خدا۔ کسی اور کا نہیں تھا۔ اور بنی اسرائیل اس کی چہیتی اولاد تھی۔ اس کا نتیجہ یہ کہ یہودیوں کو اپنی قوم کے سوا،

یہودیوں کا معبُود

دنیا کی ہر قوم سے نفرت پیدا ہو گئی۔ ان کا "خدا" ہاتھ میں آتشیں کوڑا لئے، ہر شخص سے اپنا حق وصول کرنے کے درپے تھا۔ نہ اس کے سینے میں دل تھا نہ دل میں لوچ اور لچک۔ اس "خدا" کا پرستار "مرچنٹ آف وینس" کے ڈرامے کا وہ کردار تھا جو اپنے قرضے کے بدلے میں، انسانی گوشت کا ٹکڑا کاٹنے کے لئے خنجر بدست رہتا تھا۔ (JOSEPH WHEBS) کے الفاظ میں:-

> تورات کا خدا بے شمار انسانوں کے بہائے ہوئے خون سے ہولی کھیلتا نظر آتا ہے۔ وہ خود بھی قاتل اور مفسد ہے۔ چور، غدار، انتقام کے جذبے میں ایک خونخوار عفریت۔ گنہگار اور بے گناہ دونوں کو بے رحمی سے سزا دینے والا۔ نہایت مہیب اور خوفناک۔ ظلم اور تعصب کا مجسمہ۔ متکبر اور شیخی باز۔ وعدہ خلاف۔ غلط بیان اور ڈھٹائی سے جھوٹ بولنے والا۔
>
> (IS IT GOD'S WORDS)

آپ دیکھئے کہ خدا کا یہ تصور، کس طرح یہودیوں کی پوری تاریخ کی ترجمانی کر رہا ہے۔ جب قوت ان کے ہاتھ میں تھی تو وہ کس قدر مہیب، خوفناک، ظالم اور خونخوار قوم تھی۔ اور جب ان کے ہاتھ سے قوت چلی گئی تو وہ کیسی بددیانت۔ وعدہ فراموش، جھوٹی۔ تنگ نظر اور سازشی قوم بن کر سامنے آئی۔ نہ اس وقت ان کے سامنے قانون اور عدل کا تصور تھا۔ نہ حالات بدلنے پر ان کے پیش نظر آئین و ضوابط کا احترام۔ علاوہ بریں، تورات میں جو قانون دیا گیا

تورات کا قانون

ہے۔ اس میں بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل میں کھلی ہوئی تفریق کی گئی ہے۔ مثلاً تورات کی کتاب استثناء میں ہے کہ اگر کسی اسرائیلی نے اپنے بھائی کو قرضہ دیا ہو تو سات سال کے بعد اسے وہ قرضہ معاف کر دینا ہو گا۔ لیکن غیر بنی اسرائیل سے اس کا مطالبہ بدستور رہے گا۔ (استثناء ۱۵)۔ اسی کتاب میں دوسری جگہ ہے کہ بنی اسرائیل کو بلا سود قرض دیا جا سکتا ہے لیکن غیر بنی اسرائیل کو نہیں دیا جا سکتا۔ (۲۳/۱۹) اسی طرح اگر کوئی شخص بنی اسرائیل کے کسی بچے کو اغوا کرلے تو اس کی سزا موت تھی۔ لیکن غیر بنی اسرائیل

کے نتیجے کے سلسلہ میں کسی سزا کا ذکر نہیں (۲۰/۲) ۔ بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل کی یہی وہ تفریق ہے جس کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ غیر بنی اسرائیل کے ساتھ اگر بد دیانتی کر لی جائے تو اس کا کچھ مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ (۳/۷۵) - یہ تفریق خدا کے اس تصور پر مبنی ہے جس کی رو سے سمجھا جاتا ہے کہ وہ صرف بنی اسرائیل کا خدا ہے اور بنی اسرائیل اس کی چہیتی اولاد ہے۔

عیسائیوں نے اپنے لئے جس "خدا" کو بطور معبود تجویز کیا اس کی کیفیت عجیب ہے۔ اس کی رو سے ہر انسانی بچہ پیدائشی طور پر گنہگار ہوتا ہے — اپنے کسی قصور کی وجہ سے نہیں۔ اس کے اوّلیں ماں باپ نے جو گناہ کیا تھا، اس کی پاداش میں — یعنی اس خدا کی عدالت ایسی ہے کہ اس میں بے گناہوں کو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے۔ اور مجرم بھی ایسا کہ وہ ہزار کوشش کرے، اس کلنک کا ٹیکہ اس کے ماتھے سے اتر ہی نہیں سکتا۔ اس کے بعد، اس خدا کے متعلق یہ تصور قائم کیا گیا کہ جب اس نے دیکھا کہ تمام انسان گنہگار پیدا ہو رہے ہیں اور گنہگار ہی مرتے ہیں۔ اور اس معاملہ میں وہ بالکل بے بس ہیں، تو اسے اپنی مخلوق کی اس بے چارگی پہ ترس آگیا۔ اور اس نے ان کی حالت پر رحم کھا کر، اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دے دی تاکہ اس کا خون ان لوگوں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔ جو لوگ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لے آئیں، ان کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ جو ایسا نہ کریں وہ اپنے اوّلیں ماں باپ کے گناہ کی پاداش میں جہنم میں دھکیل دیئے جاتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ خدا کے اس تصور میں، قانون کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ نہ انسان کے جہنم رسید ہونے میں اس کے اعمال کو کوئی دخل ہے۔ نہ اس سے نجات ملنے میں کسی عمل کا کوئی واسطہ۔ چنانچہ سینٹ پال، افسیون کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

> تم کو ایمان کے وسیلے ہی سے نجات ملی ہے۔ اور یہ تمہاری طرف سے نہیں۔ خدا کی بخشش ہے۔ نہ اعمال کے سبب سے ہے۔ (افسیون ۲/۸،۹)

اس سے بھی واضح تر الفاظ ہیں۔

> جتنے لوگ شریعت کے اعمال پہ تکیہ کرتے ہیں وہ سب لعنت کے ماتحت ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جو کوئی ان سب باتوں کے کرنے پر قائم نہیں رہتا جو شریعت کی کتاب میں لکھی ہیں، وہ لعنتی ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ شریعت کے وسیلے سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راستباز نہیں ٹھہرتا۔ کیونکہ لکھا ہے کہ راستباز ایمان سے جیتا رہے گا اور شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں . . . مسیحؑ جو ہمارے لئے (معاذ اللہ) لعنتی بنا اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑا دیا۔ (گلیتون ۳/۱۰-۱۴)

اس قسم کے خدا کے تصور نے، عیسائی اقوام کی تمدنی زندگی پہ جو اثر ڈالا، اس کے متعلق ہسپانیہ کا نامور پروفیسر (DR. F. DE GRACIA) کے الفاظ جنہیں برفو (BRIFFAULT) نے اپنی کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) میں نقل کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

عیسائیت میں عدل کا تصور نہیں

عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا۔ یہ اس کے تصورِ اخلاق سے

باہر کی چیز ہے۔ عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت اور ہمدردی کا اظہار کیا جن پر ظلم و ستم ہوں لیکن خود ظلم و ستم کی طرف سے ہمیشہ چشم پوشی کی . . . . سینٹ ونسنٹ فرانس کے اس قید خانے کا معائنہ کرتا ہے جو دنیا میں جیتا جاگتا جہنم ہے۔ وہ وہاں محبت کا پیغام عام کرتا ہے اور گنہگاروں کو توبہ کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن اُسے اس ظلم و استبداد کا احساس تک نہیں ہوتا جس پر اس جہنم کا نظام ہے . . . . عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی روح یکسر بے حس ہے۔

(صفحہ ۳۳۲-۳۳۳)

چونکہ نجات کا دارومدار حضرت مسیح کے کفارہ کے عقیدہ پر ٹھہرا نہ کہ انسان کے اپنے اعمال پر، اس لئے عیسائی معاشرہ میں ہر قسم کا جھوٹ اور فریب بھی، کارِ ثواب سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ سینٹ پال رومیوں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوتی ہے تو پھر مجھ پر گنہگار کی طرح کیوں حکم دیا جاتا ہے۔ اور ہم کیوں بُرائی نہ کریں تاکہ بھلائی پیدا ہو۔ (رومیوں کے نام ۳:۷)

جب اس طرح معاشرہ میں بلائیاں عام ہونے لگیں اور جھوٹ اور فریب کے بازار کھل گئے، تو انہیں بخشوانے کے لئے معافی ناموں کے شریدنے کا عقیدہ وضع کیا گیا۔ ان کی ابتداء یوں ہوئی کہ صلیبی جنگوں کے دوران میں پوپ اربن دوم (URBAN - II) نے حکم جاری کیا کہ جو لوگ بذاتِ خود شریکِ جنگ نہیں ہو سکتے، وہ اپنی طرف سے کسی اور کو بھیج دیں اور اس کے بدلے میں انہیں معافی نامہ دے دیا جائے گا جو ان کی نجات کا کفیل ہوگا۔

معافی نامے

جب پوپ (LEO - X) نے روما میں سینٹ پیٹر کا گرجا بنوانا چاہا تو اس نے بھی اسی قسم کے معافی نامے بیچنے شروع کر دیئے۔ بس پھر کیا تھا؟ ان معافی ناموں نے عام تجارت کی شکل اختیار کرلی اور ہر جگہ ان کی فروخت کے لئے ایجنسیاں قائم ہوگئیں۔ ہر گناہ کی معافی کے لئے الگ قیمت کا معافی نامہ موجود تھا۔ ان معافی ناموں کی عام فارم یہ ہوا کرتی تھی۔

تم پر خداوند یسوع مسیح کی رحمت ہو اور وہ تمہیں اپنے مقدس ترحم خسروانہ سے تمام گناہوں کی پاداش سے آزاد کردے۔ میں اس کی، اور اس کے بابرکت شاگرد، پطرس۔ پولوس۔ اور مقدس پوپ کی اس سند کی رُو سے جو مجھے انہوں نے عطا فرمائی ہے تمہیں آزاد کرتا ہوں، سب سے پہلے کلیسا کی تمام ملامتوں سے خواہ وہ کسی شکل میں ہوں۔ پھر تمہارے ہر قسم کے گناہ، حدود شکنی اور زیادتی سے، خواہ وہ کیسے ہی مہیب اور شدید کیوں نہ ہوں۔ اور میں وہ سزا تم سے اٹھا لیتا ہوں جو تمہیں تمہارے گناہوں کی پاداش میں جہنم میں ملنے والی تھی تاکہ جب تم مرو تو جہنم کے دروازے تم پر بند ہوں اور جنت کی راہیں کشادہ ہوں ... باپ بیٹے اور روح القدس کے نام پر . . . . تم بارہ پنیس کے عوض اپنے باپ کی روح کو جہنم سے نکلوا سکتے ہو۔ کیا تم ایسے ناخلف ہو کہ اپنے باپ کے لئے اس قدر سستی نجات بھی نہیں خرید سکتے۔ اگر تمہارے پاس اور کچھ نہیں، فقط ایک کوٹ ہے تو وہی اتار دو تاکہ اس قدر گراں بہا متاع خرید سکو۔" (حوالہ کے لئے دیکھئے BUCK'S THEOLOGICAL DICTIONARY INDULGENCES)

برادرانِ عزیز! آپ اس داستان سے گھبرا نہ جائیے کہ دوسروں کے نقشوں سے ہمیں کیا واسطہ۔ آپ آگے چل کر دیکھیں گے کہ یہی تصورات کس طرح آپ کے ہاں بھی اسلام کا جزوِ دین گئے۔

مجوسیوں کا معبود

مجوسیت میں خدا کا تصور ایک مستبد، مطلق العنان، ڈکٹیٹر کا سا ہے جو قہرمانیت کا مجسمہ ہے، ایک عظیم تخت پر بیٹھے، جس قسم کے جی میں آئے، احکام نافذ کرتا رہتا ہے۔ اس کے اردگرد مقربین کی جماعت رہتی ہے جسے اس کے مزاج میں خاصا دخل ہوتا ہے۔ وہ سفارش کر کے، مجرمین کو چھڑا دیتے ہیں اور رشوت لے کر بے گناہوں کو پھنسا دیتے ہیں۔ عام انسانوں کی اس تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ انہیں اپنی درخواستیں، اس کے حاجب و دربان کے گروہ کی وساطت سے بھیجنی پڑتی ہیں اور وہ اس کے لئے خاصے نذرانے وصول کرتے ہیں۔ اس کے فیصلوں کے لئے نہ کسی قاعدے کی ضرورت ہے نہ قانون کی۔ نہ وہ کسی آئین کا پابند ہے نہ ضابطہ کار ــــــ خدا کے اس تصور کا نتیجہ تھا کہ ایران میں شخصی حکومت کا دور دورہ رہا۔ ان کا شاہنشاہ، اسی خدا کا زمین پر سایہ ہوتا تھا۔ یا یوں کہئے کہ ان کا خدا، اس شہنشاہیت کا آسمان پر پرتو ہوتا تھا۔

آپ نے غور کیا، برادران! کہ جس قسم کا معبود کسی قوم نے اختیار کر رکھا ہو، اس قوم کی تہذیب و تمدن پر اس کا اثر کس قدر گہرا ہوتا ہے۔ یہ تمام معبود جن کا مختصر سا تعارف اوپر کرایا گیا ہے، ذہن انسانی کے تراشیدہ خدا تھے۔

جس قسم کا خدا اسی قسم کی تہذیب

اس میں شبہ نہیں کہ ان قوموں کی طرف وحی کی راہ نمائی آئی تھی جس نے انہیں خدا کا صحیح تصور دیا تھا لیکن وہ وحی ان کے ہاں باقی نہ رہی اور اس کے ساتھ ہی خدائے حقیقی کا تصور بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ لہٰذا، ان کے جن معبودوں کا تعارف اوپر کرایا گیا ہے، وہ وحی کا پیش کردہ خدا نہیں تھا۔ ان لوگوں کے اپنے تصور کا خدا تھا۔ وحی کی رُو سے پیش کردہ خدا کا تصور صرف قرآن کریم میں ملتا ہے جو اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں محفوظ چلا آتا ہے اور اسی طرح محفوظ چلا جائے گا کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اس میں ایک حرف کا رد و بدل بھی نہیں ہوا۔ آئیے ہم دیکھیں کہ اس خدا کا کس قسم کا تصور ہمارے سامنے آتا ہے۔

قرآن کا خدا

جہاں تک خدا کی قوت، اختیار اور اقتدار کا تعلق ہے، قرآن کریم نے بتا دیا ہے کہ وہ لامحدود ہیں۔ ان کی حد و نہایت نہیں۔ ان کی وسعتوں کا کوئی شخص اندازہ نہیں لگا سکتا۔

یہی وہ لامحدود اختیارات ہیں جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ (۳/۴۰) اپنی مرضی کے مطابق جو چاہے کرتا ہے وَيَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ . . . . وہ اپنے ارادے کے مطابق جو چاہے کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس نے کائنات کو پیدا تو اپنی منشاء اور مرضی کے مطابق کیا ہے لیکن اس کے نظم و نسق کے لئے اس نے قوانین وضع کر دیئے ہیں اور وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا۔ اس

کائناتی قوانین

اس نے خود ہی اپنے لامحدود اختیارات پر، اپنے وضع کردہ قانون کی پابندی عائد کر رکھی ہے۔ قانون کے لئے قرآن کریم میں قَدْر کا لفظ آیا ہے جس کے معنی اندازے اور پیمانے کے ہیں؛ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (۶۵/۳)۔ "اللہ نے ہر شے کے لئے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں"۔

اب کائنات کی عظیم القدر مشینری انہی پیمانوں اور اندازوں کے مطابق چلتی ہے۔ اسی کو خدا نے "سنت اللہ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی خدا کی عادت یا روش۔ اور اس روش کے متعلق کہہ دیا کہ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۳۳/۶۲)۔ تم خدا کی اس عادت یا روش میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ خارجی دنیا میں انہیں خدا کے غیر متبدل قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے۔ غور کیجئے۔ یہ کتنی بڑی پابندی ہے جسے خدا نے خود اپنے اختیارِ مطلق پر عائد کر لیا ہے۔ قرآن کریم میں خدا کے اپنے آپ پر پابندیاں عائد کرنے کا بیان بڑے بصیرت افروز انداز میں آیا ہے۔ عربی زبان میں کَتَبَ کے معنی ہوتے ہیں "کسی بات کو واجب قرار دینا" اسے فرض ٹھہرانا۔ اس ضمن میں مومنین کے متعلق کہا۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (۲/۱۸۳)۔ تم پر روزے واجب قرار دیئے گئے ہیں۔ یا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ (۲/۱۷۸)۔ تم پر قصاص لازم قرار دیا گیا ہے۔ یہ پابندیاں خدا کی طرف سے انسانوں پر عائد کی گئی ہیں لیکن بعینہٖ یہی لفظ خود خدا نے اپنے متعلق بھی استعمال کیا ہے جہاں کہا ہے كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (۶/۵۴)۔ "تمہارے رب نے اپنے آپ پر رحمت کو واجب قرار دے رکھا ہے۔" اس قدر لامنتہٰی قدرت اور اختیارات کے باوجود، اپنے آپ پر پابندی عائد کرنا، اسی خدا سے ممکن تھا جو اپنے اختیارات کو بھی قانون کے مطابق استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اور ان پابندیوں کے بعد کہا کہ ہم کبھی ان کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ ([illegible]) یہ پابندی بجائے خویش کچھ کم شدید نہیں۔ واضح رہے کہ جو پابندیاں ازخود عائد کر لی جائیں ان سے اس شخص کے اختیار و ارادہ پر کوئی حرف نہیں آتا۔ مثلاً ایک شخص کو تھانیدار حکم دیتا ہے کہ وہ ہر روز صبح، فلاں وقت پر فلاں جگہ پہنچ کر حاضری دیا کرے۔ ظاہر ہے کہ اس حکم کی پابندی، محکومی کہلائے گی۔ لیکن ایک شخص خود فیصلہ کرتا ہے کہ وہ ہر روز صبح، سیر کرتا ہوا فلاں مقام پر فلاں وقت پہنچا کرے گا۔ اور وہ التزاماً ایسا کرتا ہے۔ اس میں کبھی تبدیلی نہیں کرتا۔ اس پابندی کو محکومی نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ جو شخص اپنی زندگی خود عائد کردہ پابندیوں کے مطابق بسر کرتا ہے اور ان میں کبھی تبدیلی نہیں کرتا، تو ایسے شخص کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بڑا اصول پرست ہے۔ لہٰذا، کائنات کے نظم و نسق کے لئے قوانین وضع کرکے اس کے مطابق چلنے سے، خدا کے اختیارات پر کوئی حرف نہیں آتا۔

قانون کسے کہتے ہیں

قانون (یا LAW) کسے کہتے ہیں؛ اسے انگریزی زبان کے تین لفظوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی:-

IF – THEN – ALWAYS

یعنی اگر ایسا کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ اور ہمیشہ وہی نتیجہ نکلے گا۔ بالفاظِ دیگر، قانون کے معنی یہ ہیں کہ اس کی رو سے، ہر عمل کا نتیجہ متعین ہوتا ہے۔ جب بھی وہ عمل سرزد ہوگا، وہی نتیجہ مرتب ہوگا۔ اسی کو عدل کہا جاتا ہے۔ یعنی ہر عمل کا نتیجہ، اس سے متعلق قانون کے مطابق مرتب ہوتا ——— گندم از گندم بروید، جو ز جو ——— قانونِ فطرت اور نظامِ عدل کی صحیح تفسیر ہے۔

یہ ہے خدا کا وہ تصور جسے قرآن نے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم اس تصور کے مطابق خدا پر ایمان لاؤ تو اسے خدا پر ایمان سمجھا جائے گا۔ اگر خدا کے متعلق تصور کچھ اور ہے تو قرآن اسے ایمان باللہ تسلیم ہی نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا کے تمام انسانوں سے، خواہ وہ اپنے اپنے طور پر خدا کو مانتے

خدا پر ایمان

ہی کیوں نہ ہوں، خدا پر از سرِ نو ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے اور واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ فَاِنْ آمَنُوْا بِمِثْلِ مَا اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (۲/۱۳۷)۔ اگر یہ لوگ خدا پر اس طرح ایمان لائیں جس طرح (اے جماعتِ مومنین) تم ایمان لائے ہو، تو پھر یہ کہا جائے گا کہ یہ صحیح راستے پر ہیں۔ اسی سے ضمناً یہ بات بھی سمجھ میں آجائے گی کہ یہ جو آج کل نعرہ لگایا جاتا ہے کہ (BELIEVERS IN GOD UNITE TOGETHER) قرآن کی رُو سے وہ کس قدر فریب انگیز ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے (BELIEVER IN GOD) صرف وہی لوگ سمجھے جاسکتے ہیں جو خدا کے متعلق وہ تصور رکھیں جسے اس نے خود اپنے متعلق دیا ہے اور جو قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ یہ تصور کیا ہے؟

دو لفظوں میں یہ کہ کائنات میں خدا کی حکمرانی ایک آمرِ مطلق (ABSOLUTE DICTATOR) کی سی نہیں۔ بلکہ ایک ایسے حاکم کی سی ہے جو ہر بات قاعدے اور قانون کے مطابق کرتا ہے اور اس کے خلاف کبھی نہیں کرتا۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ کائنات میں ہر عمل کا نتیجہ وہی مرتب ہوتا ہے جو متعلقہ قانون کی رُو سے اس کے لئے متعین کر دیا گیا ہے جس طرح خارجی کائنات کے لئے خدا نے قوانین مقرر کر دیئے ہیں اسی طرح انسانی دنیا کے لئے بھی وحی کے ذریعے قوانین متعین کر دیئے ہیں۔ خارجی کائنات میں خدا کے یہ قوانین از خود جاری و ساری ہیں لیکن انسانوں کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہیں تو اپنی زندگی ان قوانین کے مطابق بسر کریں اور چاہیں تو ان کے خلاف روش اختیار کریں۔ وہ جونسی روش اختیار کریں گے، اس کے مطابق نتائج مرتب ہوں گے، یعنی جس طرح، خدا نے قوانین کی رُو سے، از خود اپنے اختیارات پر پابندی عائد کر لی، اسی طرح انسانوں کو بھی چاہیئے کہ اپنی مرضی سے، اپنے اختیارات کو ان قوانین کی حدود کے اندر رکھیں جو خدا نے ان کے لئے مقرر کر دیئے ہیں۔ معاشرہ میں اصلاح اسی صورت میں ممکن ہے کہ افرادِ معاشرہ، قانون کی پابندی برضا و رغبت کریں۔ یہی وجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار بار کہا ہے ہم نے ضابطہ قوانین عطا کر دیا ہے۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹)۔ "سو جس کا جی چاہے اسے تسلیم کرے، جو چاہے اس سے انکار کر دے"۔ رسول اللہ سے واضح الفاظ میں کہا گیا کہ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۔ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۱۰/۹۹) "کیا تو ان لوگوں کو زبردستی مومن بنانا چاہتا ہے! اگر زبردستی مومن بنانا مقصود ہوتا تو خدا کے لئے کیا مشکل تھا کہ وہ انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کرتا کہ وہ صاحبِ ایمان ہوتے۔ لیکن انسانوں کو جبراً مومن بنانا خدا کی مشیت کے خلاف تھا۔ اس نے انسانوں کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے۔ وہ ان سے ان کی یہ خصوصیت چھیننا نہیں چاہتا۔ انسان، شرفِ انسانیت اسی صورت میں حاصل کر سکتا ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی پابندی اپنے اختیار و ارادے سے کرے۔ (واضح رہے کہ معاشرہ کو شرپسند عناصر کی تخریب کاریوں سے محفوظ رکھنے کا سوال الگ ہے)۔

لاک نے کہا تھا کہ جس قسم کا خدا کوئی قوم اپنے لئے تجویز یا اختیار کر لے، اسی قسم کا اس قوم کا معاشرہ ہوگا۔ آپ سوچیئے کہ جب کوئی قوم اس خدا کو اپنا الٰہ مان لے گی جس کے ہاں حکومت قانون کی ہے، اس قوم کے معاشرہ میں بھی کس طرح قانون کی حکومت کارفرما ہوگی۔ آیئے ہم دیکھیں کہ نظامِ کائنات میں خدا کے قانون کی حکومت کس طرح کارفرما ہے تاکہ اس سے اندازہ ہو سکے کہ اس قسم کے خدا پر ایمان رکھنے والی قوم کا معاشرہ کس قسم کا ہوگا۔

کائنات میں یہ قانون کی حکومت کس طرح کارفرما ہے، اسے ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ آگ میں انگلی ڈال دیئے تو وہ جل جاتی ہے اور اس کے جلنے سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ اب

دیکھئے کہ یہ قانون کس طرح کارفرما ہوتا ہے۔

کائناتی نظامِ عدل

(۱) اگر آپ لوگوں کے سامنے آگ میں انگلی ڈالیں گے تو بھی وہ جل جائے گی اور اگر کسی کمرے کی تنہائیوں میں ——— یعنی جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو ——— ایسا کریں گے، وہ تب بھی جل جائے گی۔ بالفاظ دیگر، اس جرم کی سزا کے لئے نہ کسی گواہ کی ضرورت ہوگی۔ نہ پولیس یا خارجی عدالت کی۔

(۲) یہ بھی نہیں ہوگا کہ اگر آپ اس کا اقرار کریں کہ میں نے واقعی آگ میں انگلی ڈالی تھی، تو آپ کو درد ہو، اور اگر اس جرم کے ارتکاب سے انکار کر دیں تو آپ اس تکلیف سے بچ جائیں۔ اس جرم کی سزا بہرحال آپ کو مل کر رہے گی۔

(۳) اگر آپ چاہیں کہ کسی کو ہزاروں روپے بطور رشوت دے کر اس سزا سے بچ جائیں، تو ایسا کبھی نہیں ہو سکیگا۔

(۴) یا آپ کسی بڑے سے بڑے صاحبِ اختیار ——— حتیٰ کہ صدرِ مملکت تک ——— کی سفارش لے آئیں، تو بھی آپ اس تکلیف سے نہیں بچ سکتے۔

(۵) نہ ہی ایسا ہو سکتا ہے کہ آگ میں انگلی آپ ڈالیں اور درد کسی اور کے ہونے لگ جائے۔ یا اگر آپ کا کوئی عزیز ترین دوست اور غمخوار بھی چاہے کہ آپ کے اس درد کو ہٹا لے تو ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا۔

انسانی نظامِ عدل

اس کے برعکس، آپ یہ دیکھئے کہ انسانوں کے نظامِ عدل میں بالعموم ہوتا کیا ہے؟ اس میں ہوتا ہے کہ

(۱) اگر آپ کسی ایسی جگہ ارتکابِ جرم کرتے ہیں جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو، تو آپ اس جرم کی سزا سے بچ جاتے ہیں۔

(۲) اگر آپ پولیس کی گرفت میں آجاتے ہیں لیکن کسی طرح ان پہ کوئی اثر ڈال سکتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ آپ کا چالان ہی نہ ہو اور یوں آپ اس جرم کی سزا سے بچ جائیں۔

(۳) اور اگر بات عدالت تک پہنچ جائے تو وہاں وکیلوں کی موشگافیاں، گواہوں کا انحراف، آپ کی غلط بیانیاں یا پھر عدالت پہ اسفارش یا رشوت کے زور پہ) اثر اندازی۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ بری قرار دے دیئے جائیں۔

(۴) اگر معاملہ جیل خانہ تک بھی جا پہنچے، تو وہاں بھی اس کا امکان ہے کہ چکی کی سزا آپ کو ملے اور اسے پیسے کوئی اور۔

غرضیکہ اس قسم کے نظام میں اس کا امکان ہے کہ مجرم سزا سے بچ جائے اور بے گناہ پکڑا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ نظام، کائنات کے نظامِ عدل سے مختلف اور بے حد ناقص ہے۔ لیکن قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے

قانونِ مکافات

کہ انسانوں کے وضع کردہ معاشرتی نظامِ عدل سے الگ، خود انسانوں کی دنیا میں بھی خدا کا کائناتی نظامِ عدل کارفرما ہے جو اسی طرح، بغیر کسی سقم اور نقص کے، ہر عمل کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کرتا ہے جس طرح کائناتی نظام بلا رو رعایت، نتائج پیدا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے

کہ انسان جو کام ایسا کرتا ہے جس کا تعلق اس کی "انسانی زندگی" سے ہو، اس کا اثر اس کی ذات پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ اسی کو اس عمل (کام) کا نتیجہ کہتے ہیں۔ مثلاً آگ میں اُنگلی ڈالنے کا تعلق، انسان کی طبیعی زندگی سے ہے۔ اس کا اثر خدا کے مقرر کردہ قانونِ طبیعی کے مطابق، انسان کی طبیعی زندگی پر پڑتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو آگ میں دھکیل دیتا ہے تو اس کے اس عمل کا تعلق اس کی انسانی زندگی سے ہے جس کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اگر وہ معاشرہ کے نظامِ عدل کی رُو سے، اس جرم کی سزا سے کسی طرح بچ بھی جائے تو بھی اس کا جو اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے وہ اس کے نتیجے سے کسی صورت میں بھی بچ نہیں سکتا۔ اس کے لئے خدا کا نظامِ عدل کارفرما ہے جس میں نہ کسی گواہ کی ضرورت پڑتی ہے، نہ پولیس کی۔ نہ دنیاوی عدالت کی، نہ جیل خانے کی — پھر، چونکہ انسان کی ذات، اس کے جسم کی موت کے ساتھ فنا نہیں ہو جاتی، بلکہ آگے بھی چلتی ہے، اس لئے انسان کا کوئی عمل بلا نتیجہ رہ نہیں سکتا۔ قرآن کریم نے اسے، کہیں "یَوْمُ الدِّیْنِ" کہہ کر پکارا ہے کہیں "یَوْمُ الْقِیٰمَۃِ"۔ مطلب اس سے خدا کا نظامِ عدل ہی ہے۔ خواہ اس کے نتائج اس دُنیا میں سامنے آ جائیں یا مرنے کے بعد، اگلی زندگی میں۔ اس نظامِ عدل کی خصوصیت کبریٰ قرآن نے ان چند الفاظ میں بیان کر دی ہے۔ وَاتَّقُوْا

خدا کا نظامِ عدل

یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ (۲/۴۸)۔ اس نظامِ عمل میں کوئی شخص کسی مجرم کا ذرا سا بوجھ بھی نہیں بٹا سکتا۔ ہر ایک کو اپنے کئے کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ نہ ہی کسی کی سفارش کسی کے کام آ سکتی ہے۔ نہ ہی کوئی مجرم، اپنے جرم کے معاوضہ میں کچھ دے دلا کر چھوٹ سکتا ہے۔ اور نہ ہی کوئی شخص کسی مجرم کی کسی قسم کی مدد کر سکتا ہے۔ یہ ہے خدا کے نظامِ عدل کی بنیادی خصوصیت۔

اس مقام پر اس حقیقت کو پھر دہرا دیا جانا ضروری ہے کہ قرآنِ کریم جب خدا کے نظامِ عمل کے متعلق گفتگو کرتا ہے تو اس سے مقصد محض اس نظام کا تذکرہ کرنا یا اس کی (DESCRIPTION) دینا نہیں ہوتا۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسانوں سے کہا جائے کہ تم غور کرو کہ خدا کا کائناتی نظام کس حسن و خوبی سے چل رہا ہے اور اس کے نتائج کس قدر خوشگوار مرتب ہوتے ہیں۔ اگر تم اپنے معاشرہ میں بھی اسی قسم کا نظام قائم کر لو تو اس کا نتیجہ بھی ایسا ہی خوشگوار مرتب ہوگا — یہ نظام ان قوانین کی رو سے قائم ہوگا جنہیں قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے —

اس سے مقصد

مثلاً قرآن میں ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)۔ "دُنیا میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے سامانِ زیست کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو"۔ یہ محض ایک واقعہ کا بیان نہیں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ انسانوں کی دنیا میں بھی ایک نظام قائم ہونا چاہیئے جس میں ہر متنفس کے سامانِ زندگی کے مہیا کرنے کی ذمہ داری، اس نظام پر ہو۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو قرآن نے خدائی نظامِ عمل (یَوْمُ الدِّیْنِ یا یَوْمُ الْقِیٰمَۃِ) کے متعلق جن تفاصیل کا ذکر کیا ہے، ان سے یہ کہنا مقصود ہے کہ انسانی معاشرہ میں جو نظامِ عدل قائم ہو، اس کی خصوصیات بھی ایسی ہی ہونی چاہئیں۔ اس کے بعد تم دیکھو گے کہ یہ نظام بھی کس طرح اُسی قسم کے نتائج پیدا کرتا ہے جس قسم کے نتائج خدا کے نظامِ عدل سے مرتب ہوتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد آپ خدا کے نظامِ عدل کی موٹی موٹی خصوصیات ملاحظہ فرمائیے ۔

صرف ایک حاکمِ اعلیٰ

نظامِ عدل کے قیام کے لئے پہلی بنیادی شرط یہ ہے کہ اُس مملکت میں اختیار و اقتدارِ اعلیٰ صرف ایک اتھارٹی کا ہو ۔ اگر اس میں ایک سے زیادہ اربابِ اقتدار ہوں گے تو نظامِ عدل کبھی قائم نہیں ہو سکے گا ۔ اس بنیادی نکتہ پر قرآن نے بڑا زور دیا ہے ۔ سورۂ انفطار میں "یَوْمُ الدِّیْن" کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے ۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ (82/17)

تمہیں معلوم ہے کہ یوم الدین کیا ہے ؟ یہ بات تمہیں خدا کے سوا کوئی اور نہیں بتا سکتا ۔

اس کے بعد ہے ۔

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۗ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (82/19)

جب کوئی فرد کسی دوسرے فرد کے لئے اختیار نہیں رکھے گا ، اور حکم صرف ایک خدا کا چلے گا ۔

سورۂ حج میں ہے ۔ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ (22/56) ۔ جب اقتدار صرف خدا کا ہوگا ۔ اور وہی لوگوں میں فیصلے کرے گا ۔ اُس مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) خدا کا ہوگا اور آخری فیصلہ کرنے کا اختیار (SUPREME AUTHORITY) اس کا ہوگا ۔ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (40/12) ۔ حکم صرف خدا کا چلے گا جو بلند ترین غلبہ اور اقتدار کا مالک ہے ۔ وہی اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ (95/8) ہے ۔ اس نظام کی رو سے ارض و سماوات سب اس کے قبضۂ قدرت میں ہوں گے ۔ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ (39/67) ۔

حق پر مبنی اقتدار

لیکن یہ اقتدار و اختیار ، ظلم اور دھاندلی سے حاصل کردہ نہیں ہوگا بلکہ سرتاپا حق و انصاف پر مبنی ہوگا ۔ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ (25/26) ۔ اس میں خدائے رحمٰن کے لئے جو اقتدار و اختیار ہوگا وہ حق پر مبنی ہوگا ۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ نظامِ عدل کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ

(۱) مملکت میں آخری اختیار صرف ایک مرکزی اتھارٹی کو حاصل ہو ۔۔ اور

(۲) یہ اقتدار ، دھاندلی سے حاصل نہ کیا گیا ہو ، بلکہ حق پر مبنی ہو ۔ انسانوں کی دنیا میں حق کے معنی ہیں ، وہ قانونِ خداوندی کی رُو سے جائز ہو ۔

حکومت صرف قانون کی

لیکن یہ اختیار و اقتدار ، کسی شخص یا اشخاص کی جماعت کو اپنے طور پر حاصل نہیں ہوگا ۔ یہ اختیار صرف قانون کو حاصل ہوگا ۔ یعنی اس نظام میں فرمانروائی صرف قانون کی ہوگی ، اور جسے اوپر مرکزی اتھارٹی کہا گیا ہے اس کا کام قانون کو نافذ کرنا ہوگا ۔ اپنی مرضی چلانا نہیں ۔ خارجی کائنات میں یہ قانون ہر شے کے اندر از خود موجود ہے ۔ لیکن انسانوں کو یہ قانون وحی کے ذریعے دیا گیا ہے اور اب اپنی مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے ۔ اس لئے انسانی نظامِ عدل میں خدا کی حکمرانی کے معنی ہوں

گے اس کی کتاب کی حکمرانی۔ چنانچہ خدا نے بالتصریح کہہ دیا کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ (۵/۴۴)۔ جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتا تو یہی لوگ کافر ہیں۔

انسانی نظامِ عدل کے جن اسقام و نقائص کا شروع میں ذکر آچکا ہے، ان کے علاوہ، اس میں ایک بہت بڑی خرابی اور بھی ہے۔ اس میں خود قانون سازی کا اختیار کسی ایک انسان یا انسانوں کی جماعت کو حاصل ہوتا ہے۔

قانون سازی کا اختیار

اس کی وجہ سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ جہاں وہ قانون ساز اتھارٹی دیکھتی ہے کہ کسی قانون سے اس کے مفاد پر زد پڑتی ہے وہ اس قانون ہی کو بدل دیتی ہے۔ اس طرح خود قانون کے مطابق چلنے کی مدعی مملکت میں بھی عملاً لاقانونیت پھیل جاتی ہے۔ قانون کی کارفرمائی کا فائدہ اسی صورت میں ہے جب ہر شخص کو معلوم ہو کہ فلاں بات کے لئے قانون کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے اس بات پر کلی اعتماد اور بھروسہ ہو کہ یہ قانون جب جی چاہے بدلا نہیں جائے گا۔ قانون پر اسی قسم کا یقینِ محکم اور اعتمادِ کامل ہے جس سے انسان اطمینان کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ لہٰذا، انسانی نظامِ عدل اسی صورت میں اطمینان بخش ہو سکتا ہے جب اس کے قوانین غیر متبدل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قوانین کے متعلق جو قرآن میں

غیر متبدل قانون

مذکور ہیں، کہہ دیا کہ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (۶/۱۱۵)۔ "اور تیرے رب کا قانون صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گیا۔ اس کے قوانین میں کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں"۔ یعنی اس کی طرف سے نازل کردہ ضابطۂ قوانین ہر اعتبار سے مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ انسانی نظامِ عدل، ان غیر متبدل قوانین کو اپنے اپنے حالات کے مطابق نافذ کرنے کے لئے، جزئی تفاصیل مرتب کر سکتا ہے۔ وہ ان اصولوں میں نہ حک و اضافہ کر سکتا ہے۔ نہ تغیر و تبدل۔ اس طرح، انسانی نظامِ عدل خداوندی نظام سے ہم آہنگ ہو کر، اسی قسم کے غیر متبدل نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

انسانی نظامِ عدل میں ایک سقم یہ بھی ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف جھوٹے دعوے دائر کر دیتے ہیں۔ حکومت کسی کے خلاف کوئی کارروائی کرتی ہے تو اس کی بنیاد اس کی اپنی مشینری کی رپورٹ پر ہوتی ہے جو غلط بھی ہو سکتی ہے۔

سچی فردِ جرم

لیکن خدا کے نظامِ عدل میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس میں مجرمین کے خلاف جو فردِ جرم مرتب کی جائے گی وہ ہر نوع سے مکمل بھی ہوگی اور بالکل صحیح اور درست بھی۔ سورۂ کہف میں ہے: فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ ۔ اسے دیکھ کر ان کا رنگ فق ہو جائے گا۔ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۔ اور وہ کہیں گے کہ ہماری بدبختی! یہ کس قسم کی فردِ جرم ہے جس میں کوئی چھوٹی بڑی بات درج ہونے سے رہ ہی نہیں گئی۔ اس نے ہمارے تمام اعمال کا احاطہ کر لیا ہے: وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۔ اور وہ اس طرح اپنے تمام اعمال اپنے سامنے موجود پائیں گے: وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (۱۸/۴۹)۔ اس لئے کہ اللہ کسی پر ذرا بھی ظلم اور زیادتی نہیں کرتا۔ عدل کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ مجرم کے خلاف فردِ جرم ٹھیک ٹھیک مرتب ہو۔ اس میں کسی قسم کی غلطی یا زیادتی نہ ہو۔ مقدمہ کا فیصلہ تو بہت بعد کی چیز ہے، فردِ جرم میں غلط بیانی یا زیادتی بجائے خویش ظلم ہے۔ فردِ جرم میں حق (سچ) کے سوا

کچھ نہیں ہونا چاہیئے۔ چنانچہ خدا کے نظامِ عدل میں فردِ جرم کی یہی کیفیت ہوگی۔ اس میں مجرمین سے برملا کہہ دیا جائے گا کہ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۔ اس فردِ جرم میں تمہارے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے وہ سرتاسر حق پر مبنی ہے ؛ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (۴۵/۲۹)۔ تم جو کچھ کرتے تھے، اسے ہم ساتھ کے ساتھ لکھ لیا کرتے تھے۔ یہ استغاثہ محض سُنی سنائی باتوں پر مبنی نہیں۔ تحریری ریکارڈ پر مبنی ہے۔

غالب کو شکایت تھی کہ

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟

یہ اس کی محض شوخیٔ طبع نہیں تھی۔ یہ انسانی نظامِ عدل پر رمز و کنایہ کے انداز میں سخت طنز و تنقید تھی۔ نظامِ عدل

خود ملزم کی مرتب کردہ فردِ جرم

خداوندی میں، فردِ جرم، نہ فرشتوں کی مرتب کردہ ہوتی ہے نہ کسی اور انسان کی، یہ خود ملزم کی مرتب کردہ ہوتی ہے۔ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۔ ہر شخص کا اعمالنامہ اس کی گردن کے ساتھ لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۔ فرق یہ ہے کہ ظہورِ نتائج سے پہلے، وہ اعمالنامہ لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ ظہورِ نتائج کے وقت اسے کھول دیا جاتا ہے۔ اور ملزم سے کہا جاتا ہے کہ

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ

تو اپنا اعمال نامہ خود ہی پڑھ لے۔ اپنی مرتب کردہ فردِ جرم، عدالت میں آپ پڑھ کر سُنا۔ اور اس کے بعد، خود ہی فیصلہ کر کہ تیری سزا کیا ہونی چاہیئے۔ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا (۱۷/۱۳-۱۴)۔ آج اپنے خلاف حساب کرنے کے لئے تو خود ہی کافی ہے۔ کسی اور حساب کرنے والے کی ضرورت ہی نہیں۔

اپنے خلاف آپ گواہی

انسانی نظامِ عدل میں اگلا سقم یہ ہوتا ہے کہ مقدمہ میں ملزم کے خلاف جھوٹے گواہ پیش کر دیئے جاتے ہیں اور بے گناہ دھر لیئے جاتے ہیں۔ خدائی نظامِ عدل میں یہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (۳۶/۶۵)۔ آج تمہیں زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ تمہارے خلاف خود تمہارے ہاتھ پاؤں گواہی دیں گے کہ تم نے کیا کیا تھا۔ وہاں ہر مجرم خود اپنے خلاف آپ گواہی دے گا۔ وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ (۶/۱۳۰)۔ اسی طرح وہاں کوئی بات چھپی نہیں رہے گی۔ سب راز افشا ہو جائیں گے۔ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ (۸۶/۹)۔

قرآن کا منشاء یہ ہے کہ اس قسم کا نظامِ عدل، انسان اپنے معاشرے میں رائج کرے۔ اس مقام پر یہ کہا جائے گا کہ یہ تو ہو سکتا ہے کہ یہ نظام ایسا انتظام کر لے کہ اس کی خبر رساں ایجنسیاں جھوٹی رپورٹ نہ کریں۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ملزم خود اپنے خلاف شہادت دے۔ لیکن قرآن اسے ناممکن نہیں بتاتا۔ وہ کہتا ہے کہ

اگر انسانوں کی صحیح تربیت کی جائے تو مجرم اپنے خلاف آپ بھی شہادت دے سکتا ہے۔ اسی لئے اس کا ارشاد ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ۔ اے ایمان والو! تم دنیا میں نظامِ عدل قائم کرو اور اس کے لئے جب کبھی شہادت کی ضرورت پڑے تو مدعی یا مدعا علیہ۔ ملزم یا مستغیث کی طرف سے گواہ بن کر نہ جاؤ بلکہ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ۔ صرف خدا کے لئے گواہی دو۔ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ۔ خواہ یہ گواہی خود تمہاری اپنی ذات کے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ۔ یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا خواہ ملزم غریب ہو یا امیر۔ اس سے تمہاری گواہی پر کچھ اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا۔ تم سچائی سے ہٹ کر ان کے خیر خواہ بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم سے زیادہ خدا ان کا خیر خواہ ہے۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى۔ دیکھنا اس باب میں کہیں جذبات تم پر غالب نہ آجائیں۔ ایسا بھی نہ کرنا کہ کوئی ذو معنی یا پیچدار بات کر کے اصل حقیقت کو چھپا لو۔ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا (۴/۱۳۵)۔ یا شہادت دینے سے اعراض برتو۔ یاد رکھو! خدا تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے۔ اس لئے تم دنیا والوں سے تو بات چھپا سکتے ہو۔ خدا سے نہیں چھپا سکتے۔ یہی وہ ایمان ہے جس سے انسان کی ایسی تربیت ہو جاتی ہے کہ وہ سچی سچی شہادت دے، خواہ وہ اس کے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے نظام میں، جس میں ہر بات ٹھیک ٹھیک سامنے آجائے حتیٰ کہ

وکیل کی ضرورت نہیں

مجرم خود اپنے خلاف آپ گواہی دے دے۔ کسی وکیل کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ وکیل کی ضرورت تو غلط نظامِ عدل میں پڑتی ہے۔ نظامِ خداوندی میں اس کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے اس نے اس قسم کے وکیلوں سے کہا کہ تم دنیاوی نظام میں تو مجرمین کی طرف سے جھگڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہو، لیکن فَمَنْ یُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَمْ مَّنْ یَّكُوْنُ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا (۴/۱۰۹)۔ خدا کے نظامِ عدل میں، فیصلے کے وقت مجرمین کی طرف سے اللہ سے جھگڑنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ نہ ہی کوئی ان کا وکیل بن سکے گا۔

✡

اب اس کے بعد اگلا مرحلہ آتا ہے جس میں عدالت کو کسی طرح متاثر کر دیا جاتا ہے کہ وہ مجرم کے حق میں فیصلہ دے دے۔ خدا کے نظامِ عدل میں ایسا ہونا ناممکن ہے۔ وہاں نہ کسی کی سفارش چل سکتی ہے نہ رشوت۔ نہ کوئی فدیہ دے کر چھوٹ سکتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے۔ وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا۔ اس دن کو ہمیشہ نگاہ میں رکھو اور اپنے بچاؤ کی شکل پیدا کرو جب کوئی شخص

نہ سفارش، نہ رشوت

کسی دوسرے کے کام نہیں آسکے گا۔ وَلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ۔ نہ ہی کسی کی سفارش قبول کی جائے گی وَلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ نہ کوئی معاوضہ دے کر چھوٹ سکے گا۔ وَلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ (۲/۴۸)۔ نہ کوئی شخص مجرم کا حامی و مددگار ہوگا —— دوسری جگہ ہے یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ (۲/۲۵۴)۔ جس دن نہ انصاف بک سکے گا۔ نہ کسی کی دوستی یا سفارش کام آسکے گی۔ نہ باپ بیٹے کے کام آسکے گا نہ بیٹا باپ کے یَوْمًا لَّا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ

هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْئًا (۳۱/۳۳)۔ اس دن نہ کسی کی دولت اس کے کام آسکے گی۔ نہ اولاد۔ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ (۲۶/۸۸) غرضیکہ اس نظام میں اصول یہ ہوگا کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۳۵/۱۸) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گا۔ جس نے کوئی اچھا کام کیا ہوگا اس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔ جس نے جرم کیا ہوگا اس کی سزا بھی وہ خود بھگتے گا۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶) اور اس قانون میں نہ کوئی استثناء ہوگی نہ کسی کی رعایت۔ حتیٰ کہ اگر (بفرضِ محال) خدا کا رسول بھی، قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کرے تو اسے بھی معاف نہیں کیا جائے گا۔ سورۂ زمر میں رسول اللہ سے کہا گیا کہ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۳۹/۱۳)۔

رسول کی بھی رعایت نہیں ہوگی

تم اس کا اعلان کر دو کہ اگر میں بھی اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں یومِ مکافات سے ڈرتا ہوں۔ اس دن کا عذاب بڑا سخت ہوگا۔ اور اس میں میری بھی کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔

نظامِ عدل کو ہونا ہی ایسا چاہیئے جس میں بڑے اور چھوٹے کی کوئی تمیز نہ ہو۔ نہ کسی کے ساتھ رعایت کی جائے۔ نہ کسی سے زیادتی۔

اس نظامِ عدل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔ کسی سے کوئی ظلم اور زیادتی نہیں ہوگی۔ واضح رہے کہ یہ نظامِ عدل صرف جرائم کی سزا دہی تک محدود نہیں ہوگا۔ انسان کے ہر اچھے یا

پورا پورا بدلہ

بُرے عمل کا صحیح صحیح نتیجہ مرتب کرنے کے لئے قائم کیا جائے گا۔ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ۔ اس دن عدل کا ترازو کھڑا کیا جائے گا فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا اور کسی شخص پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہیں ہوگی۔ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا۔ اگر کسی کا کوئی عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا تو ہم اسے اس کے سامنے لے آئیں گے۔ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ (۲۱/۴۷)۔ اور ہم حساب کرنے کے لئے کافی ہیں۔ دوسرے مقام پر ہے۔ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ (۴۰/۱۷)۔ اس دن ہر متنفس کو اس کے عمل کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔ اور کسی کے خلاف کوئی ظلم اور ناانصافی کی بات نہیں ہوگی یہ قرآن کریم کے ایک دو نہیں، سینکڑوں مقامات میں مختلف انداز میں مذکور ہے (مثلاً ۱۱/۱۱۱، ۳۹/۷۰ وغیرہ) قرآن کی پوری تعلیم اسی مرکز کے گرد گردش کرتی ہے۔ یہی اس کے پیغام کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ یہی وہ بنیادی اینٹ ہے جس پر اس کے نظام کی ساری عمارت استوار ہے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (۹۹/۷-۸) جس کے نامۂ اعمال میں، ذرہ برابر بھی کوئی عمل خیر ہوگا، وہ اس کا نتیجہ بھی اپنے سامنے دیکھ لے گا، اور جس نے ایک ذرہ برابر کوئی خراب کام کیا ہوگا، اس کا نتیجہ بھی اس کے سامنے آ جائے گا۔ اور پھر اس کا مقام متعین کرنے کے لئے، ان دونوں پلڑوں کا موازنہ کیا جائے گا۔ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ۔ جس کا تعمیری کاموں کا پلڑا جھکا ہوگا وہ کامیابی و کامرانی کی زندگی بسر کرے گا۔ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۔ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝ (۱۰۱/۶-۹)۔ اور جس کا وہ پلڑا ہلکا ہوگا، وہ تباہیوں کے جہنم میں جائے گا۔ یہ ہے وہ صحیح معیارِ عدل جس کے مطابق نظامِ خداوندی میں افراد کے مقامات کا تعین ہو۔ قرآن کا منشاء یہ ہے کہ یہی معیار، انسانوں کے نظامِ معاشرہ میں بھی مقرر کیا جائے۔ نہ کسی کا کوئی

(MERIT) بلا معاوضہ (UN-REWARDED) رہ جائے، نہ کوئی مجرم، اپنے کئے کی سزا بھگتنے سے بچ سکے۔

مجرم الگ ہو جائیں

اور یہ کچھ اس طرح کھلے اور نکھرے طور پر ہو کہ معاشرہ میں شریف اور بدمعاش چھٹ کر الگ الگ ہو جائیں تاکہ کوئی شخص کسی کے متعلق دھوکے میں نہ رہے۔ خدا کے نظام عدل میں یہی صورت ہوتی ہے۔ وہاں عملاً یہ شکل سامنے آجاتی ہے کہ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (۳۶/۵۹)۔ مجرم، باقی معاشرہ سے الگ ہو جاتے ہیں۔ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ۔ وہ اپنی علامات سے پہچانے جاتے ہیں۔ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ (۵۵/۴۱)۔ اور جھٹ قانون کی گرفت میں آجاتے ہیں ایسے نظام عدل میں معاشرہ کو نہ انہیں پہچاننے میں کوئی دقت ہوگی۔ نہ گرفتار کرنے میں کوئی دشواری۔ اس میں مجرم کو کہیں پناہ نہیں مل سکے گی۔ ہر شریف آدمی دُور سے پکار اٹھے گا کہ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ (۲۸/۱۷) میں کبھی مجرموں کی پشت پناہ نہیں بن سکتا۔ اس طرح، زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ آجائے گی۔ حَتّٰى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ (۹/۱۱۸)۔ بلکہ وہ خود، اپنے جرم کی سزا پانے کے لئے حاضرِ عدالت ہو جائیں گے، اس لئے کہ انہیں یقین ہو جائے گا کہ اس (عدالت) کے سوا انہیں کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ وَظَنُّوْا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّا اِلَيْهِ (۹/۱۱۸)۔ اب یہ عدالت کے دیکھنے کی چیز ہوگی کہ جرم کی نوعیت اور مجرم کی نفسیاتی

معافی کی گنجائش

کیفیت کیا ہے۔ اگر وہ سہو و خطا کا نتیجہ ہے اور عمداً اور عادۃً سرزد نہیں ہوا۔ اور مجرم اپنی لغزش پر نادم ہے اور اس میں آیندہ کے لئے اصلاحِ حال کا امکان۔ تو وہ اسے معاف بھی کر دے گی۔ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۹/۱۱۸) خدا کے نظام عدل میں، ایسے حالات میں توبہ اور عفو کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ نظامِ خداوندی میں توبہ اور عفو سے مراد یہ ہے کہ مجرم اس کے بعد اس قدر تقویت بخش، صلاحیت آمیز، تعمیری کام کرے کہ خلاف ورزیٔ قانون سے جس قدر نقصان کسی دوسرے فرد، یا معاشرہ، یا خود اس کی اپنی ذات کا ہوا ہے اس کی تلافی بھی ہو جائے اور آئندہ کے لئے ایسے اقدام سے رُک جانے کی قدرت بھی۔ اسی کو مغفرت کہتے ہیں۔ اگر کسی پودے کو کیڑا لگ جائے تو اس کی نشو و نما رک جاتی ہے۔ لیکن اگر اسے سامان پرورش زیادہ بہم پہنچا دیا جائے اور کیڑوں سے اس کی رکھوالی کر لی جائے تو اس سے وہ کمی بھی پوری ہو جاتی ہے جو اس کی نشو و نما میں واقع ہو گئی تھی، اور اس کے بعد وہ مزید نشو و نما بھی حاصل کرے گا۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴)۔ سے یہی مراد ہے۔ یعنی حسن و توانائی پیدا کرنے والے کام خرابیاں پیدا کرنے والے کاموں کے مضر اثرات کو زائل کر دیتے ہیں۔ انسانی نظام عدل میں، اس طرح کا انتظام ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔

یہ ہے خدا کے نظامِ عدل کا وہ نقشہ جسے قرآن نے اس لئے پیش کیا ہے کہ انسان اپنے معاشرہ میں بھی اسی انداز کا نظامِ عدل قائم کرے۔ سوچئے کہ جس معاشرہ میں ایسا نظامِ عدل قائم ہو جائے اس میں قانون کے مطابق چلنے والوں کی زندگی کیسی جنت در آغوش ہو جائے گی۔ یہی قرآن کا مقصود ہے۔

یہ ہے خدا کا وہ تصور جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔ یعنی وہ خدا جس کا ہر کام قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے اور جس کا نظام یکسر عدل پر مبنی ہے۔

رحم کا تصوّر

کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں عدل کے ساتھ رحم بھی تو ہے (کیونکہ خدا رحیم ہے) قانون کے ساتھ رحم کا جوڑ کس طرح ہو سکتا ہے؟ قرآن کی رو سے، عدل کے ساتھ رحمت ہے۔ رحم نہیں۔ اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ رحم ایک جذباتی چیز ہے جو کسی پر ترس کھا کر ظہور میں آتی ہے۔ اس کا واقعی قانون اور عدل سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیت نے جب نجات کا مدار رحم پر رکھا تو اسے قانون اور عدل کے تصوّر سے یکسر دامن کش ہونا پڑا۔ عیسائیت میں رحم کے معنی یہ ہیں کہ جب خدا نے دیکھا کہ ہر انسان پیدائشی طور پر گنہگار پیدا ہوتا ہے اور اس کی یہ آلودگی، اعمال کے ذریعے کسی صورت میں بھی دور نہیں ہو سکتی، تو اسے اپنے بندوں پر رحم آیا۔ اس کے لئے اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دی تاکہ وہ انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے اور ان کی نجات ہو جائے۔

رحمت کا تصور اس سے مختلف ہے اور وہ قانون ہی کا ایک گوشہ ہے۔ آپ پہلی مثال کو پھر سے سامنے لائیے۔ آپ نے آگ میں انگلی ڈال دی اور وہ جل گئی۔ اس سے آپ کو سخت تکلیف پہنچ رہی ہے۔ لیکن جس خدا نے آگ میں یہ تاثیر رکھی ہے، اس نے ایسی دوائیاں بھی پیدا کر دی ہیں جن سے جلن کی

رحم اور رحمت میں فرق

تکلیف دور ہو جاتی ہے اور زخم بھی مندمل ہو جاتا ہے، اگر آپ ان دوائیوں کی طرف رجوع کریں گے تو آپ کی تکلیف رفع ہو جائے گی۔ یہ رجعت خدا کے ایک اور قانون ہی کی طرف ہے جو ہر ایک کے لئے عام ہے۔ یعنی جو شخص بھی اس قانونِ خداوندی کی طرف رجوع کرے گا اس سے نفع یاب ہو جائے گا۔ آگ کے ساتھ اس قسم کی دوائیوں کا پیدا کر دینا، خدا کی رحمت ہے۔ رحمت کے معنی ہیں نرمی اور رافت سے سامانِ نشوونما بہم پہنچانا۔ یہ رحم کا وہ جذبہ نہیں جو کسی پر ترس کھانے سے پیدا ہوتا ہے۔ خدا، انسانی جذبات سے بلند اور منزّہ ہے۔

اسلامی مملکت

یہ تھا خدا کا وہ تصور جسے قرآن کریم نے پیش کیا۔ اس خدا پر ایمان رکھنے والی قوم نے ایک مملکت قائم کی جس کے اوّلین سربراہ خود نبی اکرمؐ تھے۔ حضورؐ نے اس مملکت کا جو منشور جاری فرمایا اس کے سرِ فہرست یہ انقلاب آفریں اعلان تھا کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (۷۹/۳)۔

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ خدا اسے ضابطہ قوانین، حکومت، حتّٰی کہ نبوّت تک بھی دے دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم قانونِ خداوندی کی نہیں بلکہ میری محکومی اختیار کرو۔ اسے یہی کہنا چاہئیے کہ تم سب اللہ کے اس ضابطہ قوانین کی رُو سے ربّانی بن جاؤ جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور اس کی تعلیم کو تم اپنے دلوں پر نقش کرتے رہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ یہ عظیم اعلان کس طرح دنیا میں قانون کی حکومت قائم کرنے کا دستورِ اساسی بنتا ہے۔ اس کے بعد، خود نبی اکرمؐ سے کہہ دیا گیا کہ لوگ تمہارے پاس اپنے متنازعہ فیہ معاملات لے کر آئیں گے: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ

بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)۔ ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کرو۔ رسول اللہ کو اس ضابطۂ قوانین میں ردّ و بدل کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ "حزبِ مخالف" کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوتا ہے کہ اس ضابطہ قوانین کی جگہ دوسرا ضابطہ لے آؤ۔ اَوْ بَدِّلْهُ۔ یا اس میں کچھ تغیر و تبدل کر دو۔ تاکہ باہمی مفاہمت کی شکل پیدا ہو سکے۔ آپ کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا جاتا تھا کہ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ ۚ (۱۰/۱۵) یہ بات میرے حیطۂ اختیار سے باہر ہے کہ میں اس ضابطہ قوانین میں اپنی طرف سے کچھ ردّ و بدل کر دوں۔ میرا فریضہ تو اس کا اتباع کرنا ہے۔ نہ کہ اس میں ردّ و بدل کرنا۔ ردّ و بدل کرنا تو ایک طرف اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۰/۱۵)۔ اگر میں بھی اس کے کسی قانون کی خلاف ورزی کروں، تو مجھے بھی اس کی سزا ملے گی۔

واضح رہے کہ یہ جو اوپر کہا گیا ہے کہ "حزبِ مخالف" کی طرف سے اس قسم کا مطالبہ پیش ہوتا تھا تو اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اسلامی مملکت کی پارلیمان میں ایک حزبِ اقتدار (RULING PARTY) ہوتی تھی اور دوسری حزبِ مخالف (OPPOSITION) قطعاً نہیں۔ اسلامی مملکت میں ساری اُمّت ایک جماعت (پارٹی) ہوتی ہے۔ اُمّت کے اندر پارٹیوں کے وجود کا تصور غیر قرآنی اور حکمتِ فرعونی پر مبنی ہے۔ قرآن کی رو سے دنیا میں دو ہی پارٹیاں ہیں ایک امتِ مسلمہ اور دوسرے تمام غیر مسلم۔ یعنی نظامِ خداوندی کی مخالف جماعتیں۔ اسی کو ہم نے "حزبِ مخالف" کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی محمدؐ رسول اللہ کی پارٹی کے مقابلہ میں ابوجہل اور ابولہب کی پارٹی۔ یہ مطالبہ انہی کی طرف سے تھا۔

اب آگے بڑھئے۔ اس مملکت میں، قانون کی اطاعت اور شخصیتوں کی اطاعت کا فرق کس قدر بین اور واضح تھا، اس کے لئے سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن میں صرف ایک واقعہ پر اکتفا کروں گا جو اپنی نوعیت

قانون اور شخصیّت کی اطاعت میں فرق

کے اعتبار سے تو معمولی سا ہے لیکن نتیجہ کے اعتبار سے بڑا اہم اور دور رس۔ مدینہ میں ایک لونڈی تھی بریرہ نامی۔ وہ اپنے مالک سے ناراض ہو کر الگ ہو گئی۔ اس شخص کے کہنے پر آپ نے بریرہ سے کہا کہ تم اس کے پاس چلی جاؤ۔ ذرا فریقین کی پوزیشن کو سامنے رکھئے۔ کہنے والے ہیں محمد رسول اللہؐ۔ اسلامی مملکت کے واحد فرمانروا۔ مدینہ کے حاکم۔ اور کہا جا رہا ہے ایک لونڈی سے۔ کیا اس لونڈی کی جرأت ہو سکتی تھی کہ سامنے سے لب کشائی کر سکے۔ لیکن وہاں تو تربیت ہی ایسی دی گئی تھی کہ لونڈیاں تک قانون اور شخصیت میں فرق کرنا سمجھ گئی تھیں۔ بریرہ نے کہا کہ حضورؐ! آپ کا یہ حکم وحی کی رو سے ہے یا اپنا ذاتی ارشاد ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ میری اپنی سفارش ہے۔ اس پر بریرہ نے کہا کہ پھر آپ معاف فرمائیے —— میں اپنے معاملات کو خود بہتر سمجھتی ہوں —— اور آپؐ تبسم فرما کر تشریف لے گئے۔

اور یہی تھے وہ رسولؐ جنہوں نے اپنی حیاتِ ارضی کے آخری لمحہ میں واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ

اے پیغمبرؐ کی بیٹی فاطمہؓ اور اے پیغمبرؐ کی پھوپھی صفیہؓ! خدا کے ہاں کے لئے کچھ کر لو۔ میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا۔

اس لئے کہ قانون کی کارفرمائی میں کسی کی سفارش کا کیا دخل ؟

حکومت کے اس نہج پر حضورؐ کے سچے جانشینوں (رضی اللہ عنہم) نے بھی برقرار رکھا اس لئے کہ وہ بھی اسی خدا

خلافتِ راشدہ

پر ایمان رکھتے تھے جس نے قانون کا احترام سکھایا تھا۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ مملکت کے سربراہ ہوتے ہوئے یہ خود عدالتوں میں مدعا علیہ کی حیثیت سے پیش ہوتے تھے اور اگر کبھی ایسا نظر آتا کہ جج نے انہیں مدعی کے برابر نہیں رکھا بلکہ کچھ تعظیم کی ہے تو درخواست دیتے کہ مقدمہ کسی اور عدالت میں منتقل کرا لیجئے کہ جو جج فریقین میں ذرا سا امتیاز بھی ملحوظ رکھتا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس سے فیصلہ میں بھی کچھ رعایت ہو جائے۔ قانون کے دائرے سے نہ یہ خود باہر تھے نہ ان کے بیوی بچے۔ اگر انہیں دوائی کے لئے شہد کی ضرورت پڑتی اور شہد بیت المال میں موجود ہوتا تو اس کے لئے کیبنٹ کی منظوری حاصل کرتے۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کا بیٹا مملکت کی چراگاہ میں اپنا اونٹ چراتا رہا جس سے وہ اونٹ فربہ ہو گیا اور اس نے اسے منافع پر بیچ دیا۔ باپ کو علم ہوا تو انہوں نے بیٹے کو ڈانٹا اور کہا کہ تمام زرِ منافع بیت المال میں داخل کرو۔ تم نے مملکت کی چراگاہ میں اپنا اونٹ کس کی اجازت سے چرایا؟ ایک دفعہ مصر کے گورنر حضرت عمرو بن عاصؓ کے بیٹے محمد نے ایک مصری کے تازیانے مارے۔ وہ تازیانے مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ "میں بڑوں کی اولاد ہوں۔ اس لئے تمہیں تازیانے لگا سکتا ہوں"۔ جب اس کی شکایت حضرت عمرؓ کے کانوں تک پہنچی تو آپ نے حضرت عمرو بن عاصؓ اور ان کے بیٹے کو طلب کر لیا اور اس مصری کے ہاتھ میں تازیانہ دے کر کہا کہ "لے! بڑوں کی اولاد کو مار" تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ قانون کی نگاہ میں بڑے اور چھوٹے کا کوئی امتیاز نہیں۔ جب وہ اسے تازیانے لگا چکا تو آپ نے اس سے کہا کہ اس کے باپ (یعنی مصر کے گورنر) کے سر پر بھی دو چار لگا دو۔ اس لئے کہ اس کا بیٹا تمہیں کبھی نہ مارتا جب تک اسے باپ کی گورنری کا گھمنڈ نہ ہوتا۔ آپ نے حضرت عمرو بن عاصؓ کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ "عمرو! تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنانا شروع کیا ہے۔ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا"۔

یہ تو رہی قانون کی پابندی۔ وہاں کیفیت یہ تھی کہ جو بات یونہی طے پا جاتی، اس کی پابندی بھی شدت سے کی جاتی تھی اس کے لئے اس واقعہ کو سامنے لائیے کہ جب آپ شام کے سفر کے لئے گئے ہیں تو سواری کا ایک اونٹ تھا اور طے یہ پایا تھا کہ آپ اور آپ کے ملازم اس پر باری باری سوار ہوں۔ جب منزل ختم ہوئی اور عیسائی حکومت کے نمائندے استقبال کے لئے آئے تو حالت یہ تھی کہ ملازم اونٹ پر سوار تھا اور خلیفۃ المسلمین مہار تھامے آگے آگے چل رہے تھے۔ اس لئے کہ اس وقت سوار ہونے کی باری ملازم کی تھی ——— یہ سب کیا تھا؟ اس خدا پر ایمان کا کرشمہ جس نے کہہ دیا تھا کہ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ تم خدا کی روش میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ اور لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔ اس کے قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اس کے بعد بدقسمتی سے مسلمانوں میں شخصی حکومت آ گئی تو قانون کا تصور ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ شخصی

مسلمانوں میں شخصی حکومت

حکومت کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس میں قاعدہ اور قانون کوئی نہیں ہوتا۔ سب کچھ فرمانروا کی مرضی پر موقوف ہوتا ہے۔ سعدی کے الفاظ میں بادشاہوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ——— گاہے بسلامے برنجند و گاہے بدشنامے خلعت بخشند۔ کبھی کسی کے سلام کرنے پر مزاج کا پارہ چڑھ گیا تو اسے اور اس کے بال بچوں کو کولہو میں پلوا دیا۔ اور کبھی کسی کے گالی دینے پر خوش ہو گئے تو گاؤں جاگیر میں بخش دیا۔ پھر ان کے دربار میں یہ کیفیت ہوتی کہ دور دور تک حاجب و دربان پھیلے

ہوتے اور کسی فریادی کو ان تک براہِ راست پہنچنے کا یارا نہ ہوتا۔ اس کے بعد مقربین بارگاہِ عالیہ کا ایک گروہ ہوتا جنہیں بادشاہ سلامت کے مزاج میں بڑا دخل ہوتا۔ وہ مجرم کی سفارش کرتے تو پھانسی کا رسّہ اس کی گردن سے نکال دیا جاتا۔ کسی بے گناہ کے خلاف ہو جاتے تو اسے حوالۂ دار و رسن کر دیا جاتا۔ بادشاہ کے دربار میں قصیدے پڑھے جاتے۔ اس کے حضور نذرانے پیش کئے جاتے۔ مقصد اس تمام کاروبار سے بادشاہ سلامت کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا۔

جب زمین پر اس قسم کے حاکمِ مطلق کی فرمانروائی تسلیم کر لی گئی تو آسمان پہ خدا کا تصور بھی اسی قسم کا قائم کر لیا گیا اس لئے کہ ان کے ہاں یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ السلطان ظل اللہ علی الارض بادشاہ زمین پہ خدا کا سایہ ہوتا ہے جس

خدا کا بگڑا ہوا تصوّر

قسم کا زمین پہ سایہ، اسی قسم کا عرش پہ اصلی بادشاہ۔ نہ یہاں کسی قاعدے اور قانون کی پابندی نہ وہاں کسی آئین و دستور کا التزام۔ یہاں بھی ہر بات فرمانروا کی مرضی پہ موقوف، وہاں بھی ہر فیصلہ خدا کی مرضی کے ماتحت۔ یہ مرضی یہاں لحظہ لحظہ بدلتی رہتی ہے، وہ مرضی وہاں لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ یہاں بھی کامیابی کے لئے بادشاہ کی خوشنودی مطلوب، وہاں بھی حصولِ مقصد کے لئے خدا کی خوشنودی درکار۔ اور خوشنودی کے حصول کا طریقہ، جذباتی اپیل۔ اس کے بعد دیکھئے کہ جس قسم کا بادشاہ کے دربار کا نقشہ یہاں سامنے آتا ہے اسی قسم کا تصور بارگاہِ خداوندی کا ذہنوں میں منقوش ہے۔ جب بھی کسی پہ کوئی

دربارِ خداوندی کا نقشہ

مصیبت پڑتی ہے تو وہ یہ دیکھنے کے بجائے کہ میں نے خدا کے کس قانون کی خلاف ورزی کی ہے جس کا نتیجہ یہ نقصان ہے، کسی حضرت صاحب کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے تاکہ ان کی وساطت سے خدا تک اپنی فریاد پہنچائے۔ حضرت صاحب کے حضور درخواست پیش کی جاتی ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ اگر تمہارا کام بن گیا تو خدا کے نام پہ کیا دو گے۔ جب سودا طے ہو جاتا ہے، تو حضرت صاحب رات کو خدا کی بارگاہ میں پہنچ کر اس کی درخواست پر حکم لکھوا لاتے ہیں۔ چنانچہ آج کل یہ کاروبار اتنا عام ہو گیا ہے کہ ہر خلافِ قانون اقدام کے لئے جہاں افسرِ متعلقہ تک پہنچنے کی سفارش ڈھونڈی جاتی ہے، وہاں خدا تک سفارش پہنچانے کے لئے کسی زندہ یا مردہ حضرت صاحب کا سہارا تلاش کرنا پڑتا ہے۔ جہاں اُس افسر کو ہزار روپیہ رشوت کا دیا جاتا ہے وہاں، حضرت صاحب کے ارشاد کے مطابق، پانچ سو روپیہ کی "خدا کی نیاز" دی جاتی ہے۔

قیامت میں عدل

قانون والے خدا نے، قیامت کا تصور ایسا دیا تھا جس میں نہ کسی کی سفارش چل سکے گی۔ نہ فرمائش۔ نہ فدیہ دے کر چھٹکارا ہو گا نہ کفارہ دے کر۔ وہاں کامل قانون کی کارفرمائی ہو گی۔ لیکن جب خدا کے قانون کی جگہ لاقانونیت کا تصور عام ہو گیا تو قیامت کا نقشہ بھی بدل گیا۔ سینٹ پال نے کہا تھا کہ تم اعمال کے ذریعے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں بھی اسی قسم کی روایات وضع کر لی گئی ہیں کہ لَنْ

گنہگاروں کی بخشش

یَدْخُلَ اَحَدُکُمُ الْجَنَّۃَ بِعَمَلِہٖ ۔ کوئی شخص اپنے اعمال کی رو سے جنت میں نہیں جائے گا۔ جنت رسول اللہؐ کی شفاعت سے مل سکے گی۔ پھر حضورؐ کی شفاعت کے سلسلہ میں عجیب و غریب قسم کی روایات وضع کی گئیں۔ مثلاً مشکوٰۃ شریف میں (بخاری اور مسلم کے

حوالے سے) یہ روایت درج ہے کہ قیامت میں جب گنہگار تمام انبیائے کرامؑ سے مایوس ہو جائیں گے تو رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ حضورؐ ان سے فرمائیں گے کہ

میں شفاعت کا اہل ہوں (اور تمہاری سفارش کروں گا)۔ پھر میں خداوند تعالےٰ کے حضور میں حاضری کی اجازت طلب کروں گا۔ خداوند تعالےٰ مجھ کو اجازت مرحمت فرمائے گا۔ اور میرے دل میں اپنی حمد و ثنا کے الفاظ ڈالے گا کہ میں ان الفاظ سے خدا کی حمد و ثنا کروں گا (وہ الفاظ اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہیں) میں ان الفاظ سے خدا کی حمد و ثنا کروں گا اور سجدہ میں گر پڑوں گا پھر مجھ سے کہا جائے گا۔ محمد! اپنا سر اٹھا اور کہہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے میں سنوں گا۔ مانگ جو کچھ مانگنا چاہتا ہے دیا جائے گا۔ شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں کہوں گا اے پروردگار! میری اُمت کو بخشش دے پروردگار! میری اُمت کو بخشش دے۔ خداوند تعالیٰ فرمائے گا جاؤ اور دوزخ سے ان لوگوں کو نکال لو جن کے دل میں جو برابر بھی ایمان ہو۔ میں جاؤں گا۔ اور پروردگار کے حکم کے مطابق عمل کروں گا۔ اور اس کے بعد درگاہ رب العزت میں دوبارہ حاضر ہوں گا اور خدا کی حمد و ثنا انہی الفاظ میں کروں گا اور پھر سجدہ میں گر پڑوں گا کہا جائے گا۔ اے محمدؐ! اپنا سر اٹھا۔ کہہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے سنا جائے گا۔ شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں عرض کروں گا پروردگا! میں اپنی اُمت کی شفاعت کرتا ہوں۔ میں اپنی امت کی شفاعت کرتا ہوں۔ کہا جائے گا کہ جاؤ اور جس شخص کے دل میں ذرہ برابر یا رائی کی برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکال لو۔ چنانچہ میں جاؤں گا اور خدا کے حکم کے مطابق عمل کروں گا اس کے بعد پھر حضور رب العزت میں حاضری کی اجازت طلب کروں گا اور خدا کے حضور میں حاضر ہو کر انہیں الفاظ میں خدا کی حمد و ثنا کروں گا اور پھر سجدہ میں گر پڑوں گا۔ کہا جائے گا محمدؐ! اپنا سر اٹھا اور کہہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے، سنا جائے گا۔ مانگ۔ جو مانگنا چاہتا ہے۔ دیا جائے گا۔ شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں کہوں گا۔ پروردگار میری اُمت۔ میری اُمت (یعنی میری اُمت کو بخشش دے) کہا جائے گا جاؤ۔ اور جس شخص کے دل میں رائی کے چھوٹے سے چھوٹے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکال لو۔ میں جاؤں گا اور خدا کے حکم کے مطابق عمل کروں گا۔ اس کے بعد چوتھی مرتبہ پھر درگاہ رب العزت میں حاضر ہوں گا اور انہیں الفاظ میں حمد و ثنا کروں گا پھر سجدہ میں گر پڑوں گا۔ کہا جائے گا محمدؐ! اپنا سر اٹھا کہہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے سنا جائے گا۔ مانگ دیا جائے گا۔ شفاعت کر قبول کی جائے گی۔ میں عرض کروں گا۔ اے پروردگار! ان لوگوں کو دوزخ سے نکالنے کی اجازت مرحمت فرما جنہوں نے لا الٰہ الا اللہ کہا ہو (اور کوئی عمل نہ کیا ہو) خداوند تعالےٰ فرمائے گا۔ ان لوگوں کی سفارش تیرا حق نہیں ہے۔ قسم ہے اپنی عزت کی۔ اپنے جلال کی اور اپنی ذاتی اور صفاتی عظمت اور بزرگی کی میں ہی ان لوگوں کو دوزخ سے باہر نکالوں گا۔ جنہوں نے لا الٰہ الا اللہ۔ کہا ہوگا۔ (بخاری و مسلم)

(مشکوٰۃ اردو ترجمہ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۱۵ - ۳۱۶)

اور یہ کچھ، برادران عزیز! اس رسولؐ کے متعلق کہا جا رہا ہے جس نے (قرآن کی زبان میں) یہ اعلان کر دیا تھا کہ اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کی پاداش سے بچ نہیں سکتا۔ غور کیجئے کہ جو شخص اپنے جرم و خطا

کی پاداشن سے بھی نہیں بچ سکتا کیا وہ دوسرے مجرموں اور خطا کاروں کو اپنی سفارش سے پاداش عمل سے بچا سکتا ہے؟

اسی طرح ایک اور روایت میں ہے کہ اس کے بعد خدا ان لوگوں کو بھی دوزخ سے نکال دے گا جنہوں نے کوئی بھلائی نہیں کی ہوگی ان کی گردنوں میں نشانیاں اور مہریں ہوں گی جن سے یہ ظاہر ہوگا کہ انہیں کسی نیک عمل کے سبب نہیں بخشا گیا۔ (مشکوٰۃ۔ جلد دوم صفحہ ۳۱۸)

ایک اور روایت

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ دوزخ سے چار آدمیوں کو نکال دیا جائے گا اور خدا کے حضور پیش کیا جائے گا۔ اور انہیں دوبارہ دوزخ میں بھیج دیئے جانے کا حکم دے دیا جائے گا۔ ان میں سے ایک مڑکر دیکھے گا اور خدا سے عرض کرے گا۔ اے پروردگار! میں تو یہ امید رکھتا تھا کہ جب تو مجھے دوزخ سے نکال لے گا تو دوبارہ وہاں نہیں بھیجے گا۔ یہ کہہ کر رسول اللہ نے فرمایا کہ خداوند تعالےٰ اسے دوزخ سے نجات دے دے گا۔

(مشکوٰۃ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۲۲)

یہ اُس خدا کا عمل بتایا جاتا ہے جس نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ حالانکہ تم ان جاں گداز مراحل سے نہیں گزرے جن سے اُمَمِ سابقہ کو گزرنا پڑا تھا۔ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتّٰى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ اٰمَنُوا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ۔ ان کی حالت یہ تھی کہ سختیاں اور مصیبتیں انہیں چاروں طرف سے گھیر

جنت یونہی نہیں مل سکتی

لیتیں۔ ان کی شدت سے ان کے دل دہل جاتے۔ یہاں تک کہ وہ اور ان کا رسول پکار اٹھتے کہ بارِ الٰہا! تیرے قانون کے مطابق حق کی کامیابی کا وقت کب آئے گا۔ . . . ایسے ایسے ہمت شکن اور صبر آزما مراحل سے گزرنے کے بعد وہ جنت کے مستحق قرار پائے تھے۔ اسی طرح تمہیں بھی اپنے آپ کو جنت کا مستحق بنانا پڑے گا۔ محض اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، تم چھوٹ نہیں سکو گے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (۲۹/۲)۔ جنت "بخشش" سے نہیں ملا کرتی۔ اسے خونِ جگر کی قیمت ادا کر کے خریدنا پڑتا ہے۔

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ
تا جزائے عمل تست جہاں چیزے ہست

قرآنِ کریم کی ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اس قسم کی روایات جن میں اعمال کے بغیر جنت کی ضمانت دلائی گئی ہے کبھی رسول اللہ کی نہیں ہو سکتیں۔ یہ اس دور میں وضع کی گئی تھیں جب معاشرہ میں لاقانونیت پھیل چکی تھی اور مجرم سفارشوں سے چھوٹ جایا کرتے تھے یا بادشاہ سلامت کے من کی موج سے۔

اولیاء کی طرف سے بخشش

یہ تو خیر پھر بھی خدا اور اس کے رسولؐ کی باتیں تھیں، اپنے مریدوں کو جنت میں لے جانے کے متعلق مرشدانِ طریقت کے انداز اور بھی دلچسپ ہیں۔

حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے ملفوظات (دلیل العارفین) میں لکھا ہے کہ

بروزِ قیامت۔ انبیاء۔ اولیاء سب قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ ان کے کندھوں پر کمبل پڑے ہوں گے۔

ہر ایک کمبل میں کم و بیش ایک لاکھ تانے کے تاگے اور ایک لاکھ بانے کے ہوں گے۔ ان کے مرید اور پیچھے ان کے ان تاگوں کو پکڑ لیں گے اور اس وقت تک پکڑے رہیں گے جب تک خلق ہنگامہ محشر سے فارغ نہ ہو۔ پھر حق تعالے انہیں پل صراط پہ پہنچائے گا اور وہ مع اپنے پیروں کے اس بتیس ہزار برس کے راستے کو ایک دم زدن میں، بہ برکت پکڑے رہنے اس گلیم کے طے کریں گے۔ اور دروازہ بہشت پر پہنچ کر (اس گلیم کے ساتھ چمٹے رہنے کی وجہ سے) دارالنعیم میں داخل ہو جائیں گے۔

آپ ان روایات اور حکایات کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ جس قوم میں اس قسم کے خیالات اور نظریات عام کر دیئے جائیں اس قوم میں قانون کا کوئی احترام اور نیک کام کرنے کے لئے کوئی جذبہ باقی رہ سکتا ہے؟ جب حالت یہ ہو کہ ہر قسم کے

ضرور گناہ کرو

مجرم، دھڑا دھڑ جنت میں داخل ہوتے چلے جائیں تو جرائم سے اجتناب کی ضرورت کسے لاحق ہو سکتی ہے۔ جرائم سے اجتناب تو ایک طرف ہمارے ہاں یہ روایت بھی موجود ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو تو خدا تمہیں زمین سے ہٹا دے اور تمہاری جگہ دوسرا گروہ پیدا کر دے جس کا شیوہ یہ ہو کہ گناہوں میں مبتلا ہو اور پھر خدا سے بخشش و مغفرت کی طلب گاری کرے۔ (مسلم۔ ترجمان القرآن۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۰۹)

یہ حدیث، مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی تفسیر، ترجمان القرآن میں درج کی ہے۔ اسے درج کرنے کے بعد وہ بڑے فخر سے لکھتے ہیں کہ "پس فی الحقیقت حضرت مسیح (علیہ السلام) کی تعلیم میں اور قرآن کی تعلیم میں اصلاً کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کا معیار احکام ایک ہی ہے"۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ وہ تعلیم حضرت مسیح علیہ السلام کی ہے اور نہ یہ قرآن کریم کی۔ وہ یہودی الاصل، سینٹ پال کی اختراع ہے اور یہ مجوسی الاصل جھوٹے راویوں کی سازش۔ عیسائیوں نے تو اس تباہ کن تعلیم سے اس طرح پیچھا چھڑا لیا کہ مذہب کو سیاست سے الگ کر کے، گناہ اور جرم میں فرق کر لیا۔

اس کا نتیجہ

انہوں نے پادریوں سے کہہ دیا کہ وہ لوگوں سے ان کے گناہوں کا اقرار (CONFESSION) لے کر معافی نامے بھیجتے رہیں۔ مجرموں کا معاملہ دنیاوی عدالت کی رو سے طے پائے گا جہاں قانون کی کارفرمائی ہوگی۔ لیکن سوچئے کہ جس قوم کا نظریۂ زندگی یہ ہو کہ مذہب اور سیاست الگ الگ ہیں۔ اور مذہب میں ان کا عقیدہ یہ ہو کہ اگر گناہ نہ کئے جائیں تو خدا انہیں مٹا کر ان کی جگہ دوسری قوم لے آئے گا، تو ان کی سیاست کا کیا رنگ ہوگا؟ وہی رنگ جسے ہر جگہ نکھرا اور ابھرا ہوا دیکھتے ہیں۔ یعنی اس میں لاقانونیت معاشرہ کی عام روش قرار پا جاتی ہے اور ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ اگر اس نے ایسے طریقے اختیار نہ کئے جو قانون کے خلاف جاتے ہوں تو اس کی جگہ کوئی دوسرا لے لے گا کیونکہ ان کے خدا نے (معاذ اللہ) کہہ رکھا ہے کہ اگر تم جرائم کا ارتکاب نہ کرو گے تو وہ تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے گا۔ آپ سوچئے کہ جس قوم کے یہ عقائد ہوں اور وہ ان عقائد میں ہزار سال سے ڈوبی چلی آ رہی ہو، اس میں قانون کا احترام اور اس کی پابندی کا جذبہ کسی طرح بھی پیدا ہو سکتا ہے؟ یہ چیزیں قوم کے تحت الشعور میں جاگزیں ہو چکی ہیں اور جب تک یہ وہاں سے نہیں نکلیں گی، قوم میں قانون پر چلنے کی عادت پیدا ہو ہی نہیں سکے گی۔ ایک طرف آپ قوم سے کہتے ہیں کہ جرائم کا مرتکب ہونا بری بات ہے۔ دوسری طرف ان کا خدا (معاذ اللہ) ان سے یہ کہتا ہے کہ اگر تم جرائم کے مرتکب نہ ہوئے تو تمہیں مٹا دیا جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ان کا رسولؐ (پناہ بخدا) یہ جرأت دلا رہا ہے کہ تم جرائم سے مت

گھبراؤ نہیں تم سب کو، ایک ایک کرکے، دوزخ سے نکال کر جنت میں لے جاؤں گا۔ اور پیر صاحب یہ کہہ رہے ہیں کہ تم جو کچھ جی میں آئے کرتے جاؤ۔ بس تم میری گدڑی کے تاگے کے ساتھ چمٹ جانا۔ کیا مجال جو رضوان کو پتہ تک بھی لگ جائے کہ تم سمگل کرکے جنت میں پہنچائے جا رہے ہو ——— اس کے بعد فرمائیے کہ قوم آپ کے کہنے پر عمل کرے گی یا خدا اور رسول اور مرشدِ طریقت کی بات مانے گی۔؟

مغفرت اور شفاعت کا صحیح مفہوم

واضح رہے کہ "خدا کی بخشش" کے بجائے قرآن کریم کی صحیح اصطلاح "مغفرت" ہے جس کے معنی حفاظت کے ہیں۔ مطلب اس سے یہ ہے کہ اگر کسی شخص سے کوئی خطا ہو گئی ہے تو وہ اس سے توبہ کرکے اپنی روش میں تبدیلی کرے اور اس کے بعد ایسے اچھے کام کرے کہ ان کے خوشگوار نتائج سے، اس خطا کے نقصان رساں نتیجہ سے حفاظت کا سامان مل جائے۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱/۱۱۵)۔ خدا کا ارشاد ہے۔ یعنی نیک کاموں کے خوشگوار نتائج سے بُرے کاموں کے تباہ کن اثرات مٹ جاتے ہیں۔ یہ ہے مغفرت جو خدا کے قانون کی رُو سے حاصل ہوتی ہے۔

شفاعت کے معنی ہیں کسی کا کسی دوسرے کے ساتھ مل جانا اور اس طرح ایک سے دو ہو جانا، جیسے کسی فرد کا کسی جماعت کے ساتھ شامل ہو کر ان کے پروگرام کی تکمیل میں ان کا ساتھ دینا۔ دنیاوی امور میں شفاعت کے معنی ہوں گے کسی کے ساتھ تعاون کرنا۔ اس کی امداد کے لئے کھڑے ہو جانا۔ اور نظامِ عدل میں شفاعت کے معنی ہوں گے کسی کے حق میں سچی شہادت دینا ——— سفارش سے کسی مجرم کو چھڑوا دینے کا تصور قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ اس سے قرآن کے قانونِ مکافات کی ساری عمارت نیچے آگرتی ہے۔

قوموں کی زندگی پر ان کے معتقدات کا اثر بڑا گہرا ہوتا ہے۔ جب تک آپ ان غلط معتقدات کو نہیں بدلتے، قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱) کا ارشادِ خداوندی اس کی محکم دلیل ہے۔ یاد رکھئے! معاشرہ کی عمارت خدا کے تصور کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ جب تک آپ اس تصور کو قرآنی خطوط پر متشکل نہیں کرتے، معاشرہ میں اصلاح کی صورت پیدا ہو نہیں سکتی۔ اس لئے کہ جس قسم کا خدا کا تصور، اسی قسم کا معاشرہ۔ یہ ہے انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا اصل الاصول۔ اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ خدا پر ایمان کے معنی کیا ہیں اور یہ ایمان کس طرح انسانی اعمال کی بنیاد قرار پاتا ہے۔ ہمیں پہلے قرآن کریم کی روشنی میں خدا کا صحیح تصور قائم کرنا چاہیئے (اور وہ صحیح تصور ہے، ایسا خدا جس کے ہاں قانون کی حکومت کارفرما ہے) اور پھر اس تصور کے مطابق خدا پر ایمان لانا چاہیئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن نے خود مسلمانوں سے بھی خدا پر از سرِ نو ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے ——— خدا پر ہی نہیں بلکہ اس کے رسول اور کتاب پر بھی از سرِ نو ایمان لانے کا مطالبہ ——— اس نے کہا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ (۴/۱۳۶)۔ "اے مسلمانو! تم ایمان لاؤ خدا پر۔ اس کے رسول پر۔ اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی۔ اور ان کتابوں پر جو اس سے پہلے نازل کی گئی تھیں۔"

اس ایمان کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ہمارے معاشرہ میں کس طرح "قانون کی حکومت" کارفرما نہیں ہوتی!

اسلام کا سیاسی نظام

(عہدِ فاروقیؓ میں)

طلوع اسلام بابت اکتوبر ۱۹۸۵ء میں ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا۔ فاروقیت کیا ہے؟ یہ اتنا پسند کیا گیا کہ ہم سے مطالبہ کیا گیا کہ اس مقالہ میں تو اشارات پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ضروری ہے کہ جو اسلامی نظام عہدِ فاروقیؓ میں رائج تھا اس کے کچھ تفصیلی گوشے سامنے لائے جائیں۔ ان میں سرِ فہرست "سیاسی نظام" تھا۔ ان تقاضوں کی تعمیل میں، پرویز صاحب کی مایہ ناز تصنیف "شاہکارِ رسالت" سے سیاسی نظام کا عنوان پیشِ خدمت کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں دو امور کی وضاحت تمہیداً ضروری معلوم ہوتی ہے۔

(۱) پرویز صاحب بھی صدرِ اوّل کے متعلق جو کچھ لکھتے ہیں اس کا مدار بہرحال ہماری تاریخ پر ہی ہوتا ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔ اور ہماری تاریخ جس رطب و یابس کا مجموعہ ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ پرویز صاحب کا مسلک یہ ہے کہ اس تاریخ میں جو واقعات ایسے ہیں جو قرآن مجید کے خلاف نہیں، انہیں صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے کیوں کہ حضور نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی قرآن کے مطابق تھی۔ اس لئے اس دور کی تاریخ کے متعلق جو کچھ پرویز صاحب لکھتے ہیں وہ وہی ہوتا ہے جو ان کی بصیرت کے مطابق قرآن کے مطابق ہے۔ بایں ہمہ، اگر ان کی کسی تحریر میں کوئی بات قرآن کے خلاف نظر آئے تو اسے ان کا سہوِ بصیرت سمجھنا چاہئے۔ اس کی اصلاح کے لئے وہ ہر وقت آمادہ ہوتے ہیں۔

(۲) قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ بیشتر اصول و اقدار عطا کرتا ہے۔ ان پر عمل درآمد کے طریق اُمت کی صوابدید پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصولوں کو بروئے کار لانے کے طریق خود وضع کرے۔ قرآنی اصول و اقدار و قوانین تو ہمیشہ غیر متبدل رہتے ہیں، لیکن انہیں نافذ العمل کرنے کے لئے طریقِ کار۔ یا یوں کہئے کہ جزئی قوانین، اسلامی مملکت وضع کرتی ہے، وہ حالات کی تبدیلی کے ساتھ بدلے جا سکتے ہیں۔ یہی صورت صدرِ اوّل کی اسلامی مملکت کی تھی۔ لہٰذا عہدِ فاروقیؓ کے سیاسی نظام میں جو جزئی قوانین دکھائی دیں، ضروری نہیں کہ وہ عین مِن آج بھی نافذ کئے جائیں۔ آج کی اسلامی مملکت انہیں اپنے سامنے رکھے گی۔ ان میں سے جو قوانین ایسے ہوں گے جو آج بھی نافذ العمل ہو سکتے ہیں، انہیں اسی طرح نافذ کرے گی۔ دیگر قوانین میں تبدیلی کر دے گی۔ اور حسبِ ضرورت نئے قوانین کا اضافہ بھی کر سکے گی۔ بنا بریں، جب آپ عہدِ فاروقیؓ کے سیاسی نظام کو سامنے لائیں تو اس سے یہ نہ سمجھیں کہ اسی قسم کا نظام ہوبہو نافذ کیا جائے تو اسے اسلامی نظام کہا جائے گا۔ صورت یوں نہیں ہوگی۔ اس

تاریخی مطالعہ سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آئے گی کہ اس زمانے میں قرآن کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں اس طرح نظام قائم کیا گیا تھا۔ اس مطالعہ سے کہیں یہ مراد نمایاں حاصل ہوگی۔ کسی زمانے کی اسلامی مملکت کے طرق و اسالیب ابدی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتے۔

اس تمہیدی وضاحت کے بعد "شاہکار رسالت" سے سیاسی نظام کا عنوان ملاحظہ فرمائیے۔

سیاسی نظام۔ عہدِ فاروقی میں

قرآن کے سیاسی نظام (یا بالفاظِ دیگر، ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ) کا اصل الاصول، عروۃ الوثقیٰ، یا اساسِ محکم، سورۂ آلِ عمران کی وہ آیۂ جلیلہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

> کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں — خواہ خدا نے اسے ضابطۂ قوانین کا حامل یا منصبِ حکومت پر سرفراز یا مقامِ نبوت پر فائز ہی کیوں نہ کر دیا ہو کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہئے کہ تم اس کتابِ خداوندی کی رُو سے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کے حقائق و غوامض پر غور و فکر کرنے سے اس کے معانی و مقاصد کی حقیقت تک پہنچتے ہو، ربانی بن جاؤ" (۳/۷۹)

انسانی آزادی کا منشور

یہ انسانی آزادی کا وہ عظیم انقلابی منشور ہے جس کی نظیر آپ کو کہیں نہیں ملے گی۔ انسانی فکر نے بھی غلامی اور محکومی کے استبداد سے تنگ آکر اس سے نجات حاصل کرنے کی تدابیر سوچیں۔ پہلے اس نے شخصی حکومت (ملوکیت) کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے، پھر مذہبی پیشوائیت (تھیاکریسی) کی دسیسہ کاریوں کے دامِ ہمرنگِ زمین کو توڑا۔ اس کے بعد اس نے جمہوری نظام اختیار کیا۔ انسانی فکر ابھی تک اسی مقام تک پہنچ سکی ہے۔ لیکن وہ اس سے بھی مطمئن نہیں۔ اس لئے کہ انسانوں کی محکومی سے نجات، جمہوری نظام میں بھی نہیں مل سکتی۔ اس میں صرف اتنا ہوتا ہے کہ ایک شخص (ملوکیت) کی محکومی کے بجائے انسانوں کے ایک گروہ (اکثریت) کی محکومی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ یہ گروہ، دوسرے انسانوں سے اپنی اطاعت "ذاتی حکم" کی رُو سے نہیں کراتا، اپنے وضع کردہ قوانین کی رُو سے کراتا ہے لیکن محکومی کسی کے ذاتی فیصلہ کی ہو، یا اس کے فیصلہ کو قانون کا نام دے دینے کی، بات ایک ہی ہے۔ اس سے انسان، دوسرے انسانوں کی محکومی کی زنجیروں سے رستگاری حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لعنت سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ ایک ہی ہے اور وہ، وہ طریق ہے جسے مندرجہ بالا قرآنی منشورِ آزادی کے آخری حصہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ قانون سازی کا حق بھی کسی انسان (یا انسانوں کے گروہ) کو حاصل نہیں۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اسی کو خدا کا، "حقِ حکومت" کہا گیا ہے۔ سورۂ یوسف میں ہے:-

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (۱۲/۴۰)

یاد رکھو۔ حقِ حکومت خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کی جائے۔ یہی محکم نظامِ حیات ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو سمجھتے نہیں۔

خدا کا یہ حقِ حکومت اس طرح خالصتاً اسی کے لئے مختص ہے کہ وہ اس میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا

لَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ۔ (۱۸/۲۶)

وہ اپنے دائرہ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

لیکن خدا تو ہمارے سامنے (محسوس شکل میں) نہیں آتا۔ اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت

کتاب اللہ کی حکومت

(محکومیت) کس طرح اختیار کی جائے۔ اس کا جواب اس نے خود ہی یہ کہہ کر دے دیا کہ اس کی اطاعت، اس کے عطا کردہ ضابطۂ قوانین (کتاب اللہ) کی رُو سے کی جائے۔ سورۃ الانعام میں ہے:-

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِىْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۔۔۔ (۶/۱۱۵)

(اے رسولؐ! ان سے کہو) کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم قرار دے لوں، حالانکہ اس نے تمہاری طرف وہ کتاب نازل کر دی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کرتی ہے۔

یہی کفر اور ایمان میں خطِ امتیاز ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۤئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۵/۴۴)

جو اس کے مطابق فیصلے (حکومت) نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا ہے، تو یہی لوگ ہیں جنہیں کافر کہا جائے گا۔

لیکن کتاب تو ساکت و صامت حروف و نقوش کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس کی اطاعت کس طرح کی جائے؟

دین اور مذہب میں فرق

یہاں سے مذہب اور دین کا بنیادی فرق ہمارے سامنے آتا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ خیال کیا (اور دنیا کے تمام اہلِ مذاہب اسی خیال کے حامل ہیں) کہ یہ اطاعت انفرادی طور پر کی جائے گی۔ یعنی ہر فرد اپنے اپنے طور پر جس طرح جی چاہے، احکامِ خداوندی کی اطاعت کرتا رہے۔ اسے "مذہب" کہتے ہیں جس میں "خدا کی اطاعت" سے مراد اس کی پرستش ہوتی ہے۔ محکومیت نہیں ہوتی۔ لیکن قرآن، انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی نظامِ حیات کی تاکید کرتا ہے۔ اسے دین کہا جاتا ہے[1]۔ وہ کہتا ہے کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا ۔ (۳/۱۰۲) "تم اس ضابطۂ خداوندی کو اجتماعی طور پر تھامے رکھو"۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے نظامِ حکومت کی ضرورت ہوگی۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے واضح الفاظ

---

[1] مذہب اور دین کے اس فرق کے لئے میرے مجموعہ مضامین ——— بہارِ نو ——— میں "قیامتِ موجود" کا عنوان دیکھئے۔ یا میری انگریزی زبان کی کتاب 'ISLAM ; A CHALLENGE TO RELIGION'

میں کہہ دیا کہ تمہارے ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہوگا۔ (یعنی تمہاری اپنی حکومت) اسی سے تمہارے دین (اجتماعی نظامِ زندگی) کو تمکن حاصل ہوگا اور اسی سے تم اس قابل ہو سکو گے کہ خالصۃً خدا کی محکومیت اختیار کر سکو (۵۵/۲۴)۔ اس نظام (کی مرکزی اتھارٹی) کی اطاعت، خدا کی اطاعت کہلائے گی۔ ان امور کی تفصیل تیسرے اور ساتویں باب میں گزر چکی ہے۔ لیکن اس مقام پر اس کا دُہرانا اس لئے ضروری سمجھا گیا ہے کہ اس کے بغیر عہدِ فاروقی کا سیاسی نظام (جو اس کتاب کا عمودی موضوع ہے) اچھی طرح سمجھ میں نہیں آ سکے گا۔ (اس تکرار کے لئے میں قارئین کے حسنِ ذوق سے معذرت خواہ ہوں)

اسلام اپنی آزاد مملکت چاہتا ہے

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ اسلام ایک زندہ نظام (یعنی دین) کی حیثیت صرف اپنی ایک آزاد مملکت میں اختیار کر سکتا ہے۔ غیروں کی حکومت میں، یا خود مسلمانوں کی ایسی حکومت میں جس کی بنیاد کتابِ خداوندی پر نہ ہو، اسلام ایک رسمی مذہب بن کر رہ جاتا ہے، دین کی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی حکومتوں کے تابع، مسلمان، اسلام کے مطابق زندگی بسر کر ہی نہیں سکتا۔ تقسیمِ ہند سے پہلے، تحریکِ پاکستان کے دوران، ہندوستان کے علماء کی ایک جماعت کا موقف یہ تھا کہ آزاد ہندوستان میں بے شک حکومت اکثریت (یعنی ہندوؤں) کی ہوگی لیکن وہ جب ہمیں "مذہبی آزادی" کی ضمانت دیتے ہیں تو پھر مسلمانوں کے لئے الگ مملکت کا مطالبہ کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اسلام کو آزادی، صرف اپنی آزاد مملکت میں میسر آ سکتی ہے۔ جب تک مسلمانوں کی اپنی آزاد حکومت نہ ہو، قرآن کے احکام، قانونی شکل میں نافذ ہی نہیں کئے جا سکتے۔ اور (ظاہر ہے کہ) جو احکام، قانونی شکل میں نافذ نہ کئے جا سکیں، اُن کی حیثیت محض "وعظ" کی رہ جاتی ہے۔ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے قرآنی فریضہ سے مقصود ہی یہ ہے کہ احکامِ قرآنی کو قانوناً نافذ کیا جائے۔ اس کے بغیر معاشرہ کی اصلاح ہو نہیں سکتی۔ حضرت عثمانؓ کے ارشاد کے مطابق یَزَعُ اللّٰهُ بِالسُّلْطَانِ اَكْثَرَ مِمَّا يَزَعُ بِالْقُرْاٰنِ۔ تنہا قرآن سے اتنی اصلاح نہیں ہو سکتی جتنی اصلاح (قرآنی) حکومت کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ ؎

مومناں را تیغ با قرآں بس است (اقبالؒ)

سب سے پہلے حضور نبی اکرمؐ نے اس حکومت کو قائم کیا۔ اور وہی اس کی مرکزی اتھارٹی تھے۔ اس لئے خدا نے حضورؐ کی اطاعت کو خود خدا کی اطاعت قرار دیا جب فرمایا کہ وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ... (۴/۸۰) "جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے درحقیقت خدا کی اطاعت کی" قرآنِ کریم نے "اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ" (خدا اور رسول کی اطاعت) کا جو حکم بار بار دیا ہے اس سے مراد اس نظامِ خداوندی کی اطاعت ہے جسے رسول اللہؐ نے متشکل فرمایا تھا؎۔ چونکہ اطاعت درحقیقت

؎ تفصیل کے لئے دیکھئے میرا مقالہ "امرِ منتخبہ اور علماء" شائع شدہ طلوعِ اسلام بابت مئی، جون ۱۹۵۲ء۔

خدا کی (یعنی خدا کی کتاب کی) مقصود تھی۔ اس لئے رسول اللہ سے کہا گیا۔ کہ

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ.... (۵/۴۸)

تم ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔

(۲) لیکن قرآن کریم کی صورت یہ ہے کہ اس میں چند ایک احکام تو بالتصریح دیئے گئے ہیں لیکن باقی ہدایات

اصول و جزئیات کی پوزیشن

بطور اصول دی گئی ہیں۔ اس لئے ان کی جزئیات کو خود متعین نہیں کیا۔ ایسی کتاب کو جس نے تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک مسلسل اور غیر متبدل ضابطۂ حیات بننا تھا، ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا کہ اس کے اصول و اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں لیکن ان اصولوں کی روشنی میں، جزئی احکام، ہر زمانے کے تقاضوں اور اُمّت کے احوال و ظروف کے مطابق مرتب ہوتے اور بدلتے رہیں۔ اس سلسلہ میں اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ جن احکام کو ہم نے صرف اصولی طور پر دیا ہے اور ان کی جزئیات خود مرتب کر کے نہیں دیں، اس سے یہ نہ سمجھنا کہ خدا کو ایسا کرنا چاہیئے تھا لیکن یہ (معاذ اللہ) اس سے سہواً رہ گیا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْــَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْــَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ (۵/۱۰۱)

اے جماعتِ مومنین! جن امور کے متعلق کتاب اللہ خاموش ہے، ان کے متعلق خواہ مخواہ سوالات نہ کیا کرو۔ ابھی وحی کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر تمہارے سوالات کے جواب میں، وحی کے ذریعے مزید احکام دے دیئے گئے تو ان کا نباہنا تمہارے لئے دشوار ہو جائے گا۔ سو تم بیٹھے بٹھائے اپنے اوپر مزید پابندیاں عائد کرانے کا موجب کیوں بنتے ہو؟ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ۔ (۵/۱۰۲) اس سے پہلے ایک قوم (بنی اسرائیل) ایسی حماقت کر چکی ہے۔ اس نے خواہ مخواہ اپنے اوپر قسم قسم کی پابندیاں عائد کر کے زندگی کو ناقابلِ برداشت زنجیروں میں جکڑ لیا۔ اور جب انہیں نباہ نہ سکے تو دین ہی سے برگشتہ ہو گئے۔ تم ایسا نہ کرنا۔ جن امور کے متعلق وحی خاموش ہے، یہ نہیں کہ ہم ان کے متعلق ہدایات دینا بھول گئے ہیں۔ ایسا دانستہ کیا گیا ہے۔ اس آیۂ جلیلہ کی تشریح نبی اکرمؐ نے اپنی ایک حدیث میں یوں فرما دی کہ اِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوْهَا۔ وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَهِكُوْهَا۔ وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَسَكَتَ عَنْ اَشْيَآءَ مِنْ غَيْرِ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْا عَنْهَا۔

اللہ نے کچھ امور کو فرض قرار دیا ہے۔ انہیں ضائع مت کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ ان کے پاس تک نہ پھٹکو۔ کچھ حدود متعین کی ہیں۔ ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور دیگر امور کے متعلق دانستہ خاموشی اختیار کی ہے ان کے متعلق کرید مت کرو۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ زبانِ وحی جن امور کے متعلق خاموش ہے، ان میں ان احکام کی جزئیات شامل ہیں جنہیں صرف اصولی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ باقی رہے وہ احکام جنہیں متعین طور پر بیان کر دیا گیا ہے، ان کے متعلق بھی یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کریم نے نہ تو ان احوال و ظروف کا تعین کیا ہے جن کے مطابق ان احکام کو نافذ کیا جائے گا، اور نہ ہی ان شرائط کا ذکر ہے جن سے وہ مشروط ہوں گے۔

(مثلاً) اس نے سرقہ (چوری) کو قابلِ سزا جرم قرار دیا گیا ہے لیکن سرقہ کی قانونی تعریف (DEFINITION) خود متعین نہیں کی۔ یا (مثلاً) اس نے خمر اور میسر کو ممنوع قرار دیا ہے لیکن ان کی نوعیتوں اور شکلوں کی تصریح خود بیان نہیں کیں۔

بنا بریں قرآن کریم نے ان احکام کی جزئیات کا تعین جنہیں اس نے اصولی طور پر بیان کیا ہے، اور جن احکام کو بالتصریح بیان کیا ہے، ان کی شرائط و احوال کی تعیین، نظام حکومتِ اسلامی پر چھوڑ دی ہے۔ جو کچھ قرآن میں آیا ہے وہ تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہے گا لیکن ان کی تفاصیل و جزئیات، جنہیں حکومتِ قرآنی متعین کرے گی، حالات کے تقاضے کے مطابق، بدلتی رہیں گی۔ اس طرح ثبات و تغیر کے حسین امتزاج سے، کتاب اللہ، تمام نوعِ انسانی کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ضابطۂ زندگی بنتی چلی جائے گی۔

ان تفاصیل و جزئیات کا تعین سب سے پہلی اسلامی حکومت کے سربراہ، حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا۔ قرآن کریم میں حضورؐ سے ارشاد ہے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ (۳/۱۵۸) "امورِ مملکت میں اپنے صحابہؓ سے مشورہ کیا کرو۔" ظاہر ہے کہ جہاں تک وحی خداوندی کا تعلق ہے، اس میں کسی کے مشورہ کا تو ایک طرف، خود صاحبِ وحی کے ذاتی خیالات کا بھی کوئی دخل نہیں تھا۔ (۵۳/۳-۴) لہٰذا مشورہ کا حکم، ان احکامِ خداوندی کی جزئیات و تفاصیل کے متعلق تھا جنہیں خدا نے اصولی طور پر دیا تھا یا جن کی شرائط و قیود خود بیان نہیں کی تھیں۔ ان جزئیات و شرائط کو حضورؐ نے اپنے زمانے کے تقاضوں اور قومِ مخاطب کے احوال و ظروف کے مطابق، صحابہؓ کے مشورہ سے متعین فرمایا۔

رسول اللہ کی متعین کردہ جزئیات

ظاہر ہے کہ ان جزئیات و شرائط کے متعلق یہ مقصود نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی۔ اگر انہیں بھی غیر متبدل رکھنا مطلوب ہوتا تو انہیں وحی کے ذریعے، قرآن کے اندر محفوظ کر دیا جاتا۔ یا جس طرح حضورؐ نے قرآن کریم مرتب اور محفوظ شکل میں اُمت کو دیا تھا، اسی طرح اپنے فیصلوں کا مستند اور مصدقہ مجموعہ، محفوظ طور پر اُمت کو دے جاتے۔ لیکن نہ خدا نے، قرآن کریم میں ان تفاصیل کو بیان کیا اور نہ ہی رسول اللہ نے انہیں محفوظ طور پر اُمت کو دیا (احادیث کے متعلق حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کا طرزِ عمل باب چہارم میں بتایا جا چکا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی۔) اس سے واضح ہے کہ ان جزئیات کا ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھنا نہ منشائے خداوندی تھا، نہ مقصودِ رسالت۔ حضورؐ نے اس کے برعکس، ایک ایسا اصول بیان فرمایا جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اُمت کے لئے، اپنے زمانے کے اسلامی نظام کے فیصلوں کا اتباع ہی مقصودِ خدا و رسول تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ۔

(مشکوٰۃ۔ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

تم پر میرے طریقے اور میرے صاحبِ رشد و ہدایت جانشینوں کے طریقے کی پیروی لازم ہے۔

حضورؐ کا یہ ارشادِ گرامی قرآن کریم میں بیان کردہ اس حقیقت کی تبیین ہے کہ

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِن

مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ . . . . (۳/۱۴۴)

محمدؐ بجز اس نیست کہ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول ہو گزرے ہیں۔ سو اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم (یہ سمجھ کر کہ دین کا نظام آپؐ کی ذات تک محدود تھا) پھر اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔؟

بات بالکل واضح ہے کہ دین کا نظام، حضورؐ کی ذات تک محدود نہیں تھا۔ اسے آپؐ کے بعد بھی بدستور آگے چلنا تھا۔ اس نظام میں جس طرح حضورؐ کی زندگی میں "مرکزِ نظام کی اطاعت" خدا اور رسولؐ کی اطاعت تھی۔ یہی شکل حضورؐ کے جانشینوں کے زمانے میں بھی رہے گی۔ اسی نظام کو قرآن کریم نے "سبیل المومنین" کہہ کر پکارا ہے یعنی جماعت مومنین کا راستہ۔ (۴/۱۱۵)

ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ ایسا کیوں ہوا۔ لیکن (عام عقیدہ کے مطابق) خلافتِ راشدہ اوّلین چار خلفاءؓ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس لئے حضورؐ نے جو فرمایا تھا کہ "تم پر میری اور میرے خلفائے راشدین کے طریقے کی پیروی لازم ہے"۔ اس کا اب عملی مفہوم، حضورؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ (چار خلفاءؓ کی سنت (طریق) لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ نہ تو حکمِ خداوندی تھا، نہ ارشادِ نبویؐ کہ خلافتِ راشدہ، چار خلفاء تک محدود رہے گی۔ دین کے نظام کا تو ہمیشہ کے لئے جاری رہنا مطلوب تھا۔ یہ اتفاق تھا (اور امت بلکہ نوعِ انسانی کی بدقسمتی) کہ وہ نظام زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہا۔ لیکن اگر وہ قائم رہتا (اور جب تک قائم رہتا) تو اس کی اطاعت "خلافتِ راشدہ" کی اطاعت قرار پاتی۔ یعنی امت کے لئے اطاعت اپنے زمانے کے نظامِ اسلامی کی لازم ہوتی، نہ کہ کسی سابقہ زمانے کے نظام کی۔ اور اس کی وجہ حضورؐ نے خود ہی یہ کہہ کر بیان فرما دی کہ:

الناس اشبہ بزمانھم من اسلافھم۔ (جاحظ البیان والتبیین)

لوگ اپنے اسلاف کے مقابلہ میں اپنے زمانے کے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔

اسی بنا پر امام ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ

اگر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے پاتے اور میں آپؐ کو پاتا (یعنی ہم دونوں ہمعصر ہوتے) تو آپؐ میرے اکثر اقوال کو اختیار فرما لیتے۔ دین اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ایک اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔ (تاریخ بغدادی - جلد ۱۳ - صفحہ ۲۹)

زمانے کے تقاضوں کے مطابق فیصلے

مطلب یہ ہے کہ نبی اکرمؐ پیش آمدہ معاملات کے فیصلے، قرآن کے اصولی احکام کی روشنی میں صحابہؓ کے مشورہ سے کیا کرتے تھے۔ اگر میں (یعنی امام اعظمؒ) اس زمانے میں ہوتا تو آپؐ اکثر معاملات میں میری رائے قبول فرما لیتے اور اس طرح میری رائے شریعت کا حکم قرار پا جاتی۔ امام اعظمؒ کے اسی مسلک کی تشریح کرتے ہوئے بغدادی نے لکھا ہے کہ:

ابوعوانہ نے بیان کیا کہ میں ایک روز ابوحنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی

آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چُرا لیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابوحنیفہؒ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ فوراً اس کی مدد کو پہنچیے۔ ورنہ اس شخص کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ آپ نے پھر بلا کسی ہچکچاہٹ کے کہا کہ وہ حکم گزر چکا اور ختم ہو چکا ہے

(بغداد[ی]۔ جلد ۱۳۔ صفحہ ۴۹)

مطلب واضح ہے کہ حضورؐ کا وہ فیصلہ اس زمانے کے حالات کے مطابق تھا۔ آج حالات بدل چکے ہیں۔ اس لئے اس فیصلہ میں بھی تبدیلی ہونی چاہیئے۔ اسی اصول کے مطابق "تعلیل الاحکام" میں آیۂ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (۲۱/۱۰۷) کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ

زمانے کے بدلنے سے نئے نئے مصالح پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر صرف منصوص ہی کا اعتبار کیا جائے تو لوگ سخت مصیبت میں پھنس جائیں۔ یہ بات رحمت کے منافی ہوگی۔

(تعلیل الاحکام۔ صفحہ ۲۸)

یعنی حضورؐ کے رحمت للعالمین (تمام زمانوں کے لئے رحمت) ہونے کا تقاضا ہے کہ ہر زمانے کے حالات کے مطابق احکام نافذ کیے جائیں۔ امام ابن قیمؒ نے اسے اور بھی واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ جیسے کہا کہ:

شریعت اللہ کا مقصود بندوں میں عدل و انصاف کا قیام ہے۔ جس طریق کے ذریعے عدل و انصاف قائم کیا جائے گا وہی دین ہوگا۔ اسے دین کے خلاف نہیں کہا جائے گا۔ (الطرق الحکمیہ)

یعنی دین کے اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان اصولوں پر عمل اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق کیا جائے گا۔ علامہ اقبالؒ نے اس اصول کے متعلق اپنے خطبات (تشکیل جدید) میں بڑی بصیرت افروز بحث کی ہے۔ وہ پہلے شاہ ولی اللہؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ:

پیغمبرؐ کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم تیار کرتا ہے اور اسے ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسان کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کی عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رو سے اس رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں، اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، اس لئے انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ (چھٹا خطبہ)

اس کے بعد علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں کہ:۔

غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظمؒ نے جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے، اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے

کہ انہوں نے اپنی فقہ کا مدار حدیثوں پر کیوں نہیں رکھا۔

اس کے بعد انہوں نے (علامہ اقبالؒ نے) لکھا ہے کہ :-

اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس تو ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیرات کے پیکر دنیا میں ہوتی ہے جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل و تغیر پذیر عناصر میں موافقت پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن ابدی اصولوں کے متعلق اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں — وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے — تو اس سے زندگی (جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے) یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی زندگی میں جو ناکامی ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظرانداز کر رکھا ہے۔ (ایضاً)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ

یہ سوال کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں، بڑا اہم ہے اور بہت سی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً ہاں میں ہونا چاہئے بشرطیکہ اسلامی دنیا عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ

حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے

دَورِ فاروقی میں اس اصول پر عمل

اب ہم اس دَور کی کچھ مثالیں سامنے لاتے ہیں۔ (یعنی دَورِ فاروقی کی) جس میں یہ "روحِ عمرؓ" عملی پیکر وں میں کارفرما تھی۔ جب حضرت عمرؓ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں تو حضورؐ کے زمانہ کو گزرے ہوئے تھوڑا سا عرصہ ہوا تھا — یعنی یہی دو تین برس — لیکن چونکہ اب مملکت کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ اس لئے حالات میں کافی تبدیلی آ رہی تھی۔ اسی حقیقت کے پیش نظر آپ نے (حضرت عمرؓ نے) فرمایا تھا کہ :

بے شک خدائے بزرگ و برتر حالات اور زمانے کے تقاضوں سے لوگوں کے لئے نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ (کتاب المیزان)

چنانچہ ان کا طریق کار یہ تھا کہ جب کوئی نیا معاملہ سامنے آتا آپ سابقہ ادوار کی حکومتوں (یعنی رسالت مآبؐ

اور عہد صدیقیؓ) کو دیکھتے ۔ اگر وہاں سے کوئی ایسا فیصلہ ملتا جو اس معاملہ کے تقاضوں کو پورا کر دیتا تو اسے من و عن نافذ کر دیتے ۔ اگر اس میں کسی ترمیم و تنسیخ یا حک و اضافہ کی ضرورت ہوتی تو ترمیم شدہ فیصلہ صادر فرما دیتے اور عند الضرورت اپنا جدید فیصلہ نافذ کر دیتے ۔ اور بعض اوقات (حالات کی تبدیلی کے پیشِ نظر) خود اپنے سابقہ فیصلہ میں بھی تبدیلی کر دیتے ۔ یعنی وحی کے متعین کردہ احکام و اصول اپنی جگہ غیر متبدل رہتے لیکن ان کے عملی نفاذ کی شکلوں اور جزئیات میں حالات کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہتیں ۔ ثبات و تغیر کا یہی حسین امتزاج ہے جس سے اسلام ایک عالمگیر اور ابدی نظامِ حیات بن سکتا ہے ، اور عہدِ فاروقی اس کی درخشندہ مثال پیش کرتا ہے ۔

(۱) نظامِ مشاورت

کسی سابقہ حکم کا من و عن نافذ کر دینا کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا ، لیکن ان احکام کا اپنے زمانے کے حالات کے مطابق نافذ کرنا یا غیر متبدل اصولوں کی جزئیات کا پیشِ نظر تقاضوں کے مطابق متعین کرنا ، بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے ، بالخصوص جب ان احکام و جزئیات نے دین کی حیثیت اختیار کرنی ہو ۔ اسی مشکل کے پیشِ نظر ، قرآن کریم نے رسول اللہؐ کو بھی حکم دیا کہ ان امور میں اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرو (۳/۱۵۸) اور حضورؐ کے بعد اُمت سے بھی کہا کہ ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے (۴۲/۳۸) یہ وجہ ہے جو دین کے نظام میں مشاورت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے ۔

یورپ نے ملوکیت اور تھیاکریسی سے تنگ آکر جمہوریت (ڈیماکریسی) کا نظام وضع کیا ، اور اس کے حق میں ایسی ڈگڈگی بجائی کہ ساری دنیا اُسے آیۂ رحمت سمجھنے لگ گئی ۔ ان کی دیکھا دیکھی ، مسلم اقوام نے بھی اُسے اپنے ہاں رائج کر لیا اور طُرفہ تماشہ یہ کہ اسے عین مطابق اسلام قرار دے دیا چنانچہ

مغربی جمہوریت اور اسلام

آج اس نظریہ کو مسلّمہ کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ "جمہوریت عین اسلام" ہے بلکہ یہ کہ جمہوریت کی طرح ہی اسلام نے ڈالی تھی ۔ یہ تصور غلط اور یکسر اسلام کے خلاف ہے ۔ مغربی جمہوریت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اقتدار مطلق (Sovereignty) عوام کو حاصل ہے ۔ عوام کے نمائندے جس قسم کا جی چاہے قانون مرتب کر سکتے ہیں ۔ انہی کا فیصلہ حرفِ آخر ہے ۔ ان سے بالا کوئی اتھارٹی نہیں ۔ یہ سیکولرازم ہے جو اسلام کی نقیض ہے ۔ اسلام میں اقتدار اعلیٰ کسی ایک ملک کے عوام یا ان کے نمائندگان تو ایک طرف ، پوری نوعِ انسان کو بھی حاصل نہیں ۔ اقتدار مطلق صرف خدا کو حاصل ہے ۔ اور اسلامی نظام (یعنی اُمت کے نمائندگان) کتاب اللہ کے حدود کے اندر رہتے ہوئے قوانین مرتب کر سکتے ہیں ۔ مغربی انداز جمہوریت اور اسلام کے نظامِ مشاورت میں یہ بنیادی فرق ہے جسے کبھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے ۔ اسلامی نظام کو آپ "کنٹرولڈ ڈیماکریسی" کہہ سکتے ہیں یعنی وہ جمہوریت جس

پر قرآن کا کنٹرول ہو۔

مشاورت کی مشینری

قرآن کریم نے، امت کے لئے مشاورت کو ضروری تو قرار دیا لیکن، اپنے مخصوص انداز کے مطابق مشاورت کی مشینری خود وضع نہیں کی۔ اسے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مشاورت کا طریق کار خود متعین کرے۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں زندگی بڑی سادہ سی تھی اس لئے مشاورت کی مشینری بھی کچھ ایسی وسیع و عریض نہیں تھی۔ اس کے لئے طریق کار کیا تھا، اسے ساتویں باب کے شروع میں بیان کیا جا چکا ہے آپ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیں۔ مختصراً" امیر المومنین کی مجلس مشاورت" اعیان مدینہ تک محدود تھی اور اہم معاملات میں صوبوں کے نمائندوں کو بھی بلا لیا جاتا تھا مجلس مشاورت میں حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ جیسے اولوالعزم صحابہؓ شامل تھے۔ یہ سب معمر اور پختہ کار تھے۔

نوجوانوں اور عورتوں سے مشورہ

لیکن حضرت عمرؓ نوجوانوں کی بھی حوصلہ افزائی فرماتے رہتے۔ اور اکثر معاملات میں ان سے بھی مشورہ لیا کرتے حتیٰ کہ عورتوں سے بھی۔ عام انتظامی امور اور بندوبست کے سلسلہ میں آپ ذمی رعایا کو بھی شریک مشاورت کر لیتے تھے۔ کیوں کہ ان معاملات کا تعلق بیشتر ان سے ہوتا تھا۔[1] آپ دیگر مملکتوں کے آئین و قوانین کا بھی مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں "غیر مسلم" بلا روک ٹوک مکہ معظمہ آتے جاتے تھے (کتاب الخراج۔ امام ابو یوسف۔ بحوالہ شبلی نعمانی) دیگر ممالک کے احوال و کوائف اور قوانین و ضوابط کے متعلق ان کے ذریعے بھی معلومات حاصل کی جاتی تھیں۔

اکثریت کے فیصلے

مغربی انداز جمہوریت میں یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ سربراہ مملکت پارلیمان کی اکثریت کے فیصلوں کا پابند ہوتا ہے یا اُسے ویٹو کے اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں آئین سازی کے سلسلہ میں، اس موضوع پر بڑی بحث و تمحیص ہوتی رہی اور (جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے) اسے اسلامی معیار کے مطابق پرکھنے کے مدعی، اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کی تائید اور مخالفین کی تردید میں صدر اول سے اسناد پیش کرنے لگے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ہم اس اصول کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام میں یہ انداز ہی صحیح نہیں کہ جو معاملہ پیش آئے اس کے فیصلہ کے لئے صدر اول کے طریق کو بطور سند پیش کر دیا جائے۔ اول تو اس دور کی تاریخ میں مخالف، موافق ہر قسم کے شواہد اور اقوال مل جاتے ہیں۔ (اور مسلمانوں میں صدیوں سے چلے آنے والے اختلافات کا بنیادی

---

[1] ابن الجوزی بحوالہ طنطاوی۔ (مطبوعہ بیروت صفحہ ۱۷۰) یہ بات یاد رکھئے۔ غیر مسلموں سے مشورہ لیا جا سکتا ہے۔ انہیں شریک حکومت نہیں کیا جا سکتا۔ جس حکومت کا مقصد کتاب اللہ کے احکام کا عملی نفاذ ہو اس میں وہ لوگ کیسے شریک ہو سکتے ہیں جو اس کتاب پر ایمان ہی نہ رکھیں۔ ہ

سبب یہی ہے)۔ دوسرے، قرآنی نظام کی رُو سے، کسی سابقہ دَور کا کوئی فیصلہ، آنے والے دَور کے لئے قولِ فیصل نہیں قرار پا سکتا۔ اُن کا فیصلہ اُن کے زمانے کے احوال و ظروف کے مطابق تھا، ہمارا فیصلہ ہمارے زمانے کے تقاضوں کے مطابق۔ سابقہ ادوار کے فیصلوں سے بطور نظائر تو فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ انہیں سند اور حرفِ آخر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بنا بریں، اس قسم کی بحثیں، بجز اس کے کہ ان سے اختلافات بڑھیں، کوئی مفید مطلب نتیجہ مرتب نہیں کر سکتیں۔

اس سوال کے متعلق کہ سربراہِ مملکت، اکثریت کے فیصلوں کا پابند ہے یا اسے ویٹو کا اختیار بھی حاصل ہے، صدرِ اوّل کی تاریخ میں دونوں قسم کے شواہد مل جاتے ہیں۔ ایسے واقعات بھی جن میں امیر المومنینؓ نے اکثریت کے فیصلوں کو تسلیم کر لیا ہو۔ حتیٰ کہ طبقات ابنِ سعد میں، عمالِ حکومت کے نام حضرت عمرؓ کی یہ ہدایت بھی ملتی ہے کہ "جس معاملہ میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو، اس میں صحابہؓ کی اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ کرنا چاہئے"۔ اور حضرت صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کے ایسے فیصلے بھی جو اکثریت کی رائے کے خلاف تھے۔ (مثلاً) رسول اللہؐ کی وفات کے بعد، مانعین زکوٰۃ کا جو پہلا معاملہ زیرِ غور آیا تو حضرت ابوبکرؓ کی رائے یہ تھی کہ ان کے خلاف جنگ کی جائے اور صحابہؓ کی بڑی اکثریت اس کے خلاف تھی۔ (ان میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے) لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اکثریت کی رائے کو نظر انداز کرتے ہوئے، عمل اپنے فیصلے کے مطابق کیا۔ اور اس فیصلے کی اطاعت، مخالف و موافق سب نے بدل و جان کی۔ (یہی اُس دَور کی خوبی تھی) اس ضمن میں دو اہم امور پیشِ نظر رکھنے کے قابل ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر معاملہ کے متعلق اصولی ہدایت قرآن کریم میں موجود ہوتی تھی اور فیصلہ طلب معاملہ صرف یہ ہوتا تھا کہ اس اصول پر عمل کس طرح کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ امیر المومنین اگر اکثریت کی رائے کو مسترد کرتا تھا تو وہ ایسا دھاندلی سے نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے فیصلے کے حق میں دلائل و براہین پیش کرتا اور اختلاف رکھنے والوں کو مطمئن کرتا۔ وہ جو کچھ کرتا کھلے بندوں کرتا اور اس کے لئے قرآنی سند پیش کرتا (مثلاً) جب عراق کی زمینوں کا سوال سامنے آیا ہے (جس کی تفصیل معاشی نظام میں پیش کی جائے گی) تو صحابہؓ کی اکثریت نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اختلاف کیا۔ اس پر کئی دنوں تک بحث ہوتی رہی اور بحث میں ہر شخص پوری جرأت اور بے باکی سے اپنا نقطۂ نظر پیش کرتا رہا۔ (اسی کو روحِ جمہوریت کہتے ہیں)۔ اس پر بھی معاملہ جب کسی فیصلہ کُن مرحلہ تک نہ پہنچ سکا تو حضرت عمرؓ نے مزید غور و فکر کے لئے مہلت چاہی۔ اس مہلت کے وقفہ کے بعد، جب انہوں نے اس مسئلہ کو مجلسِ مشاورت کے سامنے دوبارہ پیش کیا تو اس سلسلہ میں جو افتتاحی تقریر فرمائی، وہ غور طلب ہے۔ آپ نے فرمایا:-

سند کتاب اللہ کی ہوتی تھی

میں نے آپ حضرات کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ آپ اس امانت کے بارے میں میرا ہاتھ بٹائیں جسے میرے کندھوں پر رکھ دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ میں بھی آپ ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ آج آپ حضرات نے حق کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔ بعض لوگوں نے میری مخالفت کی ہے اور بعض نے موافقت۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ

میری بات محض اس لئے مان لیں کہ وہ میری بات ہے۔ آپ لوگوں کے پاس کتاب خداوندی ہے جو حق کے ساتھ بات کرتی ہے۔ اگر میں بھی کسی معاملہ میں لب کشائی کرتا ہوں تو حق کے لئے ایسا کرتا ہوں۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اس دوران میں غور و فکر کے بعد مجھے قرآن کریم سے ایسی راہ نمائی مل گئی ہے جس کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل بآسانی ہو سکتا ہے اور وہ یہ آیات ہیں۔ اس پر مخالفین نے کہا کہ اب ہمارا سینہ بھی کشادہ ہو گیا ہے اور ہم آپ سے اتفاق کرتے ہیں۔ یہ تھا اختلافی امور میں انداز اپنی رائے کے پیش کرنے کا۔ اور اسی بنا پر حضرت ابن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ:

جب عمرؓ کوئی راہ اختیار کر لیتے تو وہ بات ہمارے لئے آسان ہو جاتی تھی۔

اس کے باوجود آپ اپنی رائے اور وحی کے بنیادی فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ آپ نے ایک دفعہ

وحی اور اپنی رائے میں فرق

کسی معاملہ میں رائے دی تو کسی نے کہا کہ "یہ اللہ اور عمرؓ کی رائے ہے"۔ آپ نے اُسے فوراً ڈانٹا اور فرمایا کہ "تو نے یہ بہت بڑی بات کہی ہے، یہ صرف عمرؓ کی رائے ہے۔ اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے، اور غلط ہے تو عمرؓ کی طرف سے"۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہے۔ اور پھر فرمایا کہ "یاد رکھو! رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اسے امت کے لئے سنت نہ بناؤ"! اس باب میں وہ اس قدر محتاط تھے کہ اپنی زندگی کے آخری سانس میں، جب جسم سے اس قدر خون بہ رہا تھا اور آپ درد کی شدت سے نڈھال تھے، آپ نے اپنے بیٹے (حضرت عبداللہ بن عمرؓ) سے کہا کہ "وہ ہڈی لاؤ۔ جس پر میں نے دادا کے حصہ کے متعلق کچھ لکھا تھا"۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ اس تحریر کو مٹا دیا جائے۔ بیٹے نے کہا کہ آپ اس وقت سخت تکلیف میں ہیں۔ یہ کام آپ کی طرف سے ہم بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ نے سختی سے کہا کہ تم اس کی اہمیت اور میری ذمہ داری کو نہیں سمجھتے۔ جاؤ۔ وہ ہڈی لاؤ۔ چنانچہ آپ اطمینان سے نہ بیٹھے جب تک وہ ہڈی نہ آ گئی۔ اور آپ نے اپنی تحریر کو اپنے ہاتھوں سے نہ مٹا ڈالا۔ — احتیاط یہ تھی کہ عمرؓ کی رائے بعد میں آنے والوں کے لئے سند نہ بن جائے۔

آیئے! اب ہم دیکھیں کہ خدا کی وحی اور اپنی رائے میں فرق کرنے والوں کے دور میں قانون سازی کا طریق کار کیا تھا — یہ گوشہ گہری توجہ اور غور و فکر کا متقاضی ہے کہ اس میں ثبات و تغیر کا وہ امتزاج جو دین کی اہمیت کا ضامن ہے، بڑے حسین انداز میں نکھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

---

(۲) قانون سازی کا طریق

اسلامی مملکت کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ قرآنی احکام و ضوابط کی تنفیذ، اور اس کے اصول و اقدار کی ترویج کا ذریعہ ہے۔ اس کے لئے اس کا طریق کار یہ ہے کہ ہر دور کی حکومت:

(۱) اپنے سے پہلے دَور کی حکومت کے فیصلوں کو علیٰ حالہٖ قائم رکھتی ہے۔

(۲) لیکن اگر زمانے کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق، ان میں کسی ردّ و بدل کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ ان میں مناسب ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ کر دیتی ہے۔ اور

(۳) اگر کسی معاملہ کے متعلق پہلے سے کوئی فیصلہ موجود نہ ہو، تو وہ نیا فیصلہ صادر کر دیتی ہے لیکن

(۴) سابقہ فیصلوں میں تغیر و تبدل ہو یا کسی نئے فیصلہ کا صدور، اس کا کوئی اقدام قرآنی حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آزادی کی فضائے بسیط میں اڑنے والے پرندے کی طرح ؎

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ نگاہ او بشاخِ آشیانہ

یہ "شاخِ آشیانہ" خدا کی کتابِ عظیم ہے جسے اس نے حبل اللہ (اللہ کی محکم رسی) اور عروۃ الوثقیٰ (ناقابلِ شکست سہارا) کہہ کر پکارا ہے۔ اس "سہارے" کو حضرت عمرؓ نہایت مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ انہوں نے جابیہ کے خطبہ میں فرمایا:-

قرآن کے مطابق احکام

مجھے اللہ نے جو حکومت عطا کی ہے اس کی اصلاح صرف تین چیزوں سے ہو سکتی ہے۔ امانت کی ادائیگی۔ (مجرمین اور مخالفین کی) قوت کے ساتھ گرفت۔ اور کتابِ خداوندی کے مطابق حکم دینا۔

اپنے ایک اور خطاب میں فرمایا :-

حاکم کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ رعایا ان فرائض کا لحاظ کر رہی ہے یا نہیں، جو اللہ نے ان پر عائد کر رکھے ہیں۔ ہم تمہیں انہی باتوں کا حکم دیں گے جن کا اللہ نے حکم دیا ہے اور ان چیزوں سے روکیں گے جن سے اللہ نے روکا ہے۔

یہ واقعہ مشہور ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ اپنی بیویوں کا مہر مقرر کرنے میں بڑی افراط سے کام لے رہے ہیں تو آپ نے ایک اجتماع میں اس کا ذکر کیا اور چاہا کہ مہر کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کر دی جائے۔ اس پر ایک کونے سے ایک عورت کی آواز آئی کہ یہ کیا؟ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے کہ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ۔ (۴/۲۰) "اور تم نے بیویوں میں سے کسی کو ڈھیروں مال بھی دے دیا ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔" حضرت عمرؓ یہ سن کر بول اٹھے کہ عورت نے سچ کہا ہے، عمرؓ غلطی پر تھا۔

(ضمناً) ہم سمجھتے ہیں کہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو حضرت عمرؓ نے یہ بات اصولِ مساوات کی اہمیت اور قرآن کے مطابق بات کرنے کے سلسلہ میں لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لئے کہی ہوگی، ورنہ قرآن کے اس حکم سے یہ لازم نہیں آتا کہ مہر پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ اوّل تو اس آیت میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ تم جس قدر مہر مقرر یا ادا کر چکے ہو، اس میں سے کچھ واپس نہیں لے سکتے۔ دوسرے یہ کہ قرآن نے جس بات کو مطلق (بلا قیود و شرائط) چھوڑا ہے۔ اسلامی نظام، مصالحِ امت کے پیشِ نظر اسے مقید کر سکتا ہے — یعنی اس پر شرائط عاید کر سکتا ہے۔ بہرحال یہ ایک ضمنی گوشہ تھا۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ خلافتِ فاروقی

میں بھی اصلاً و اساساً اطاعت احکامِ خداوندی ہی کی تھی۔ باقی رہیں ان احکام کی جزئیات اور ان کے تعین کا طریق کار، سو اس باب میں حضرت عمرؓ نے اصولاً ان فیصلوں کو برقرار رکھا جو ان سے پہلی حکومتوں (عہدِ رسالت مآبؐ اور دورِ صدیقیؓ) نے صادر کئے تھے، لیکن تغیرِ حالات کے ماتحت جن فیصلوں میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی، ان میں تبدیلی بھی کر دی۔ کتبِ روایات میں ان اختلافی فیصلوں کی تفاصیل موجود ہیں۔ ہم ان میں سے چند ایک بطورِ مثال پیش کرتے ہیں:-

اختلافی فیصلے

(۱) سب سے پہلی مثال تو وہ ہے جو آج تک اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ حضرات میں مابہ النزاع چلی آ رہی ہے۔ روایات میں ہے کہ اگر کوئی شخص بیک وقت تین دفعہ طلاق کہہ دے تو رسول اللہؐ اور حضرت صدیقؓ کے زمانے تک اُسے ایک طلاق ہی شمار کیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ خلافت میں دو سال تک یہی قانون رہا۔ لیکن اس کے بعد حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ اس باب میں غیر محتاط ہوتے جا رہے ہیں تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایسی طلاقیں تین شمار ہوں گی (یعنی یہ ایسی طلاق متصور ہو گی جس کے بعد یہ میاں بیوی آپس میں نکاح نہیں کر سکیں گے۔)

(ضمناً۔ ہماری بصیرت کے مطابق، قرآن کریم کی رُو سے "تین طلاقوں" کا مفہوم اور قاعدہ کچھ اور ہے۔ اس کی وضاحت میری کتاب "قرآنی قوانین و اقدار" میں ملے گی۔ اس روایت کو جس مقصد کے لئے درج کیا گیا ہے، وہ ذرا آگے جا کر سامنے آئے گا۔)

(۲) رسول اللہؐ کے زمانے میں قانون یہ تھا کہ اگر کوئی غیر مسلم، اسلام قبول کر لیتا تو جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ اس کے پاس رہتی لیکن حضرت عمرؓ نے اس میں یہ تبدیلی کر دی کہ اس کی جائیداد غیر منقولہ اس بستی کے غیر مسلموں میں تقسیم کر دی جاتی اور اس کی کفالت کے لئے حکومت کی طرف سے (باقی مسلمانوں کی طرح) وظیفہ مقرر کر دیا جاتا۔

(۳) رسول اللہؐ کے زمانے میں شراب خوار کو جوتے وغیرہ مار کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شرابی کی سزا چالیس کوڑے مقرر کی، اور حضرت عمرؓ نے اُسے بڑھا کر اسی کوڑے کر دیا۔

(۴) قرآن کریم نے صدقات میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ رکھا تھا یعنی جن لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر کسی قسم کا ناقابلِ برداشت نقصان پہنچے، ان کے نقصان کی تلافی کے لئے حکومت ان کی مالی امداد کرے۔ یہ حکم عہدِ رسالت مآبؐ اور دورِ صدیقیؓ میں جاری رہا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر اسے بند کر دیا کہ اب مسلمانوں کے حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں، اس لئے اس امداد کی ضرورت نہیں رہی۔

(۵) ارکانِ حج میں رمل بھی ایک رکن ہے یعنی طواف کے وقت، پہلے تین چکر ذرا تیز چل کر لگائے جاتے ہیں۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ رسول اللہؐ جب مکہ سے مدینہ تشریف لائے تو مخالفین نے مشہور کر دیا کہ وہاں جا کر مسلمان بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ اس پر حضورؐ نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ طواف میں ذرا اکڑ کر تیز چلا کریں تاکہ مخالفین دیکھ لیں کہ ہم یہاں آ کر کمزور نہیں ہو گئے۔ اس سے یہ روش حج کا ایک رکن (ضروری معمول) بن گئی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں کہا کہ اب ہمیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے جو وہ حالات

رہے، نہ وہ مصلحت، نہ وہ مخالفین رہے نہ ان کا خطرہ۔ اب ہمیں معمول کے مطابق طواف کرنا چاہیئے۔

(۶) قرآن کریم نے مسلمانوں کے لئے اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح اور ان کے ہاں کا کھانا حلال قرار دیا ہے لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی عورتوں سے یہ کہہ کر نکاح کو ممنوع قرار دے دیا کہ یہ عورتیں مسلمانوں کے معاشرہ میں فتنہ کا باعث بن جاتی ہیں۔ اور مسلمانوں کی بستیوں سے یہود و نصاریٰ کے ذبیحہ خانے یہ کہہ کر بند کرا دیئے کہ اب ہمیں ان کی ضرورت نہیں رہی۔

(۷) حضرت عمرؓ نے اُمِّ ولد (یعنی وہ لونڈی جس کے مالک سے اسے اولاد ہو گئی ہو) کی بیع ممنوع قرار دیدی حالانکہ رسول اللہ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں اس کی ممانعت نہیں تھی۔ (واضح رہے کہ یہ حکم ان لونڈیوں کے متعلق تھا جو اسلام سے پہلے دَور کے معاشرہ میں موجود تھیں۔ "غلام اور لونڈیوں" کے متعلق تفصیلی بحث پچھلے باب میں آچکی ہے)۔

(۸) اس سلسلہ کی سب سے اہم مثالیں دو (۲) ہیں۔ ایک عراق کی زمینوں کے متعلق فیصلہ۔ اس اہم واقعہ کی تفصیل تو ہم "معاشی نظام" سے متعلق باب میں بیان کریں گے۔ اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ (جیسا کہ اس سے پہلے بھی منشی لکھا جا چکا ہے) رسول اللہ اور خلافتِ صدیقیؓ میں قانون یہ تھا کہ مالِ غنیمت مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ فتح عراق کے وقت، مالِ غنیمت میں کثیر مزروعہ زمینیں بھی ملیں۔ سابقہ قاعدہ کے مطابق، مطالبہ ہوا کہ انہیں بھی سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے لیکن حضرت عمرؓ نے اس سے اختلاف کیا، اور کہا کہ ان زمینوں کی پیداوار پر ساری امت اور آنے والی نسلوں کی پرورش کا دارومدار ہے اس لئے انہیں انفرادی ملکیت میں نہیں دیا جا سکتا۔ یہ مملکت کی تحویل میں رہیں گی۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ حضرت عمرؓ کا برقرار رہا۔ یہ سابقہ معمول سے بڑا اہم اختلاف تھا۔

دوسری مثال، افرادِ امت کے وظائف کے تعین کا معیار تھا۔ رسول اللہ اور حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں اس کا معیار، ہر فرد یا خاندان کی معاشی ضرورت تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس قانون کو بدل دیا اور اسلام کی خدمت کے لحاظ سے مدارج مقرر کر کے انہیں وظائف کا معیار قرار دے دیا۔ یہ اختلاف بھی بہت اہم تھا جس کی تفصیل "معاشی نظام" میں پیش کی جائے گی۔ وہیں یہ بھی بتایا جائے گا کہ ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق یہ حضرت عمرؓ کا اجتہادی سہو تھا۔ جس کا بعد میں انہیں خود بھی احساس ہو گیا لیکن قبل اس کے کہ وہ اس کا ازالہ کرتے، ان کی شہادت ہو گئی۔

یہ ان امور کی چند ایک مثالیں ہیں جن میں حضرت عمرؓ نے عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ صدیقیؓ کے فیصلوں سے اختلاف کیا۔ ان کے علاوہ، جو نئے امور سامنے آئے ان کے متعلق آپ نے (پہلی بار) اپنے فیصلے صادر فرمائے۔

اوّلیات حضرت عمرؓ

انہیں حضرت عمرؓ کی "اوّلیات" کہا جاتا ہے اور ان کی فہرست طویل طویل ہے۔ ظاہر ہے کہ جب مملکت کی وسعت اس قدر بڑھ گئی تھی اور نئے نئے امور نہایت تیزی سے سامنے آرہے تھے، تو مملکت کے لئے ضروری تھا کہ ان کے تصفیہ کے لئے ضروری احکام نافذ اور قواعد و ضوابط منضبط کرے۔ ان میں سے چند ایک (تمثیلاً) درج ذیل کئے جاتے ہیں:-

(۱) خزانہ قائم کیا۔ (۲) سن ہجری رائج کیا۔ (۳) دفاتر قائم کیے۔ اور رجسٹر مرتب کرائے۔ (۴) مردم شماری کرائی۔ (۵) شہر آباد کرائے۔ نہریں کھدوائیں۔ (۶) عشورہ (یعنی محصول چنگی) کی ابتدا کی۔ (۷) دریائی پیداوار اور گھوڑوں پر زکوٰۃ (حکومت کا ٹیکس) عائد کیا۔ (۸) نماز تراویح جماعت سے قائم کی۔ (۹) نماز فجر کی اذان میں اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کا اضافہ کیا۔ (۱۰) مساجد میں روشنی کا انتظام کرایا۔ وغیرہ ذالک

حاصلِ بحث

ان تفصیلات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اسلامی نظام میں :-

(۱) قانون کا سرچشمہ، قرآن کریم ہے۔ اس کے احکام، اصول اور اقدار سب غیر متبدل ہیں۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا کسی کو حق حاصل نہیں۔

(۲) جن امور کو قرآن نے جائز قرار دیا ہے، اگر اسلامی نظام چاہے تو (بتقاضائے حالات) انہیں وقتی طور پر ممنوع قرار دے سکتا ہے۔ یاد رہے کہ اسلامی نظام انہیں ابدًا حرام قرار نہیں دے سکتا۔ مصالحِ امت کے مطابق ان پر وقتی پابندی عائد کر سکتا ہے۔ نہ ہی وہ کسی حرام کو حلال قرار دے سکتا ہے۔

(۳) جن احکام کو قرآن نے مطلق (بلا شرائط و قیود) بیان کیا ہے، اسلامی نظام ان پر حسبِ ضرورت قیود اور شرائط عائد کر سکتا ہے۔ اور بعض احکام کو وقتی طور پر ساقط العمل بھی قرار دے سکتا ہے۔

(۴) سابقہ ادوار کے فیصلوں میں، خواہ وہ رسول اللہ کے زمانے میں ہی کیوں نہ صادر ہوئے ہوں، ردّ و بدل کر سکتا ہے۔ اور بعض فیصلوں کو منسوخ بھی کر سکتا ہے۔

(۵) نئے پیش آمدہ معاملات کے متعلق نئے احکام بھی صادر کر سکتا ہے۔

یہ ہے اسلامی حکومت میں قانون سازی کا اصول۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ احکام و قوانین میں کسی قسم کا ردّ و بدل، یا حک و اضافہ، صرف اسلامی نظامِ حکومت کر سکتا ہے۔ کسی فرد یا کسی جماعت کو اس کا حق حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس باب میں حضورؐ کا یہ ارشادِ گرامی واضح ہے کہ :

رسول اللہ نے فرمایا کہ فیصلہ کرنے کا حق امیر کو حاصل ہے یا اسے جسے امیر اس مقصد کے لئے مقرر کرے۔

حضرت عمرؓ نے اس کی تشریح میں فرمایا تھا کہ :-

یہ کام اس کے لئے رہنے دینا چاہئے جو اس کے نفع و ضرر کا ذمہ دار قرار پا سکتا ہے۔

یہ تھا اسلامی نظام میں قانون سازی کا اصول لیکن جب (بعد میں) مسلمانوں کی گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی تو پھر یہ تمام اصول بدل گئے۔ اس وقت، نہ اسلامی نظامِ حکومت باقی رہا، نہ اس کا مرکز۔ دین اور سیاست

پاکستان میں

میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ اور سیاست حکومت نے ۔ ۔ ۔ ۔ اپنی تحویل میں لے لئے، ۔ ۔ ۔ ۔ اور مذہبی امور علماء کے سپرد کر دیئے۔ "مذہبی امور" سے مراد تھی عقائد کی بحث اور پرسنل لاز (شخصی قوانین)۔ بالفاظ دیگر، اس وقت، اسلام (دین کے بجائے) مذہب بن کر رہ گیا اور مسلمانوں کی حکومت سیکولر ہو گئی۔ مملکت کے معاملات میں فرماں رواؤں نے اپنی من مانی

کی، اور مذہبی امور میں علماء اور فقہاء نے اپنا حکم چلایا۔ امت کے مرکز (اسلامی نظام) کے خاتمے کا لازمی نتیجہ تھا کہ امت میں فرقے پیدا ہو جاتے — فرقے، جن کے وجود کو قرآن نے شرک قرار دیا ہے۔ (۳۲/۳۰) چنانچہ فرقے پیدا ہوئے اور ہر فرقے نے اپنے اپنے مسلک کے مطابق فتوے دینے شروع کر دیئے۔ یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔

تشکیلِ پاکستان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ یہاں پھر سے صدرِ اوّل کے اسلامی نظام کا احیاء کیا جائے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا سوال قانون سازی کا تھا۔ جب یہ بحث چھڑی تو اسلامی نظام کا تصور کسی کے سامنے نہیں تھا۔ اس لئے ہر فرقہ نے اپنی اپنی بات کہنی شروع کر دی۔

(۱) ایک فرقہ نے کہا کہ جو کچھ کتبِ احادیث میں درج ہے اسلامی حکومت کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ اس میں سے کسی حکم کو معطل یا منسوخ کر دینا تو درکنار، اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل بھی کر سکے۔ ایسا کرنا انکارِ سنت ہوگا۔ نیز اسلامی حکومت کو اس کا حق بھی حاصل نہیں کہ وہ کوئی نیا حکم نافذ کر سکے۔ یہ بدعت ہوگی جس کی دین میں قطعاً اجازت نہیں۔

(۲) دوسرے فرقہ نے کہا کہ جو کچھ ہمارے ائمہ فقہ نے فیصلہ کر دیا ہے، اسلامی حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ من و عن ان فیصلوں کو نافذ کرے۔ ان میں کسی قسم کے تغیّر و تبدل کا اُسے حق حاصل نہیں۔

جدید امور کے متعلق ان میں سے بعض لوگ اتنی اجازت دیتے ہیں کہ اسلامی حکومت، فقہاء کے فیصلوں کی روشنی میں نئے احکام نافذ کر سکتی ہے۔ لیکن دوسرے حضرات اس کی بھی اجازت نہیں دیتے وہ کہتے ہیں کہ اب اجتہاد کا دروازہ یکسر بند ہے۔

(۳) جہاں تک قرآنی احکام کا تعلق ہے، اہلِ حدیث کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہؐ کی حدیث، قرآنی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے[1]۔ اور اہلِ فقہ کا عقیدہ کہ اگر قرآن کی کوئی آیت، ان کے ائمہ کے کسی فیصلہ کے خلاف ہو تو اوّل تو اس آیت کی ایسی تاویل کرنی چاہیے جو ائمہ کے فیصلہ کے مطابق ہو۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکتا ہو تو قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھنا چاہیے۔ (تاریخ فقہ اسلامی۔ علامہ خضری ص۲۲۱)۔

(ان امور پر تفصیلی بحث آخری باب میں ہوگی)۔

اس وقت ہمارے علماء کرام کا یہی مسلک ہے اور تعجب ہے کہ اہلِ حدیث حضرات ہوں یا اہلِ فقہ، حضرت عمرؓ کو مومن حقّا اور خلیفۂ راشد تسلیم کرتے ہیں، اور انکے عہدِ خلافت کو اسلامی حکومت کا بہترین آئینہ دار قرار دیتے ہیں۔

ان حضرات کا جو مسلک اوپر بیان کیا گیا ہے اور جس کے متعلق انہیں اصرار ہے کہ وہ عین اسلام ہے ظاہر ہے کہ اس کی رُو سے قانون سازی کے سلسلہ میں کوئی حکومت بھی دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا

---

[1] مثلاً قرآن کی آیت متعلقہ وصیت کو ایک حدیث نے منسوخ کر دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو "فتنہ انکارِ حدیث" از علامہ محمد ایوب مرحوم۔ صفحہ ۸۵)۔

نہیں کرسکتی۔ لیکن چونکہ (اس پچیس سالہ عہد میں) کسی حکومت میں اس کی جرات نہیں تھی کہ وہ عہدِ فاروقیؓ کی نظیر پیش کرکے، قانون سازی کے لئے صحیح اسلامی طریق اختیار کرے اور اس طرح علماء حضرات سے جھگڑا مول لے، اس لئے انہوں نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ آئین میں تو یہ الفاظ درج کر دیئے جائیں کہ پاکستان میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا، لیکن عملاً وہی کچھ ہونے دیا جائے جو ہو رہا ہے۔ لہٰذا ہم آج بھی اسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں انگریز کے عہدِ حکومت میں تھے۔ (اس سلسلہ میں راقم الحروف اپنے اقدامات کا تذکرہ کرنے کے لئے قارئین سے معذرت خواہ ہے)۔

میں نے جرأت کی اور کہا کہ قانون سازی کے لئے ہمارے سامنے عہدِ فاروقیؓ بہترین نمونہ ہے۔ ہمیں ان اصولوں کے مطابق ضابطہ قوانین مرتب کرلینا چاہئے۔ علماء حضرات نے اسے "انکارِ سنت" قرار دے کر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ اور اس کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھ گئے ___ اسلامی ضابطہ قوانین نہ بننا تھا، نہ بنا، نہ بن سکے گا۔ اس کا اعتراف خود ان حضرات نے بھی کر لیا ہے کہ کتاب و سنت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک قابلِ قبول ہو[1]۔ یہ اعتراف بھی ہے، اور اس پر اصرار بھی کہ ضابطہ قوانین "کتاب و سنت" کے مطابق مرتب ہونا چاہئے۔ یا للعجب!

یاد رکھئے! وہی اسلامی حکومت، اسلامی ضابطہ قوانین مرتب کرسکے گی جو خلافتِ فاروقیؓ کو اپنے لئے اسوۂ (نمونہ) قرار دے کر وہ عہد، عہدِ رسالت مآبؐ اور عہدِ صدیقیؓ دونوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

لیکن ایسا وہی کرسکے گا جو صرف خدا کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرے، علماء حضرات کے کفر کے فتووں سے نہ ڈرے۔ اس مقام پر ہم ایک بار پھر اقبالؒ کے الفاظ دہرا دینا چاہتے ہیں کہ:

"ایسا وہی حکومت کرسکے گی جو روحِ عمرؓ کو لے کر آگے بڑھے۔"

معلوم نہیں اس کی سعادت کس ملک کے حصے میں آئے گی؟

آواز حق اٹھتا ہے کب، اور کدھر سے 	مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر

—o—

(۳) قانون سازی ہی نہیں ___ سیرت سازی بھی

حضرت عمرؓ اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ قانون خواہ کیسا ہی مکمل، جامع، اور استقام سے منزہ کیوں نہ

---

[1] یہ کتاب ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ 	[2] "اگر مسلمانوں کی ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قائم ہونے کے لئے یہ شرط قرار دے دی جائے کہ ملک میں جتنے مختلف مسلکوں کے مسلمان موجود ہیں وہ سب کسی ایک مسلک پر متفق ہو جائیں تو یہ شرط نہ کبھی پوری ہوگی نہ اس شرط کے ساتھ دنیا میں کوئی اسلامی ریاست قائم ہو سکے گی...... "کتاب و سنت" کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں، جو پبلک لاء کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔" (ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ بحوالہ ایشیا۔ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

ہو، وہ کبھی صحیح نتائج پیدا نہیں کر سکتا جب تک اس قانون کو نافذ کرنے والوں کی سیرت صحیح سانچوں میں نہ ڈھلی ہو۔ بنا بریں، وہ قانون سازی کے ساتھ ساتھ، ان انسانوں کی سیرت و کردار پر بھی کڑی نگاہ رکھتے تھے جنہوں نے ان قوانین کو عملاً نافذ کرنا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کے رفقاء کا گروہ بھی ان مہاجرین و انصار پر مشتمل تھا جن کے مومنِ حقّا ہونے کی شہادت خود قرآن نے دی تھی (۸/۷۴)۔ لیکن مومنین کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ "کبائر الاثم" (بڑے بڑے عیوب و جرائم) سے مجتنب رہتے ہیں۔ البتہ معمولی لغزشوں (لمم) کا ان سے امکان ہو سکتا ہے (۵۳/۳۲)۔ اس قسم کی معمولی لغزشیں، عام لوگوں کی صورت میں کوئی خاص مضر اثر پیدا نہیں کرتیں (کیونکہ ان کے اعمال و افعال کا اثر متعدی نہیں ہوتا) لیکن جو ارباب نظم و نسق کے ہاتھ میں لاکھوں (کروڑوں) انسانوں کا حال اور مستقبل ہو، اور ان کی قیادت کی اہم ذمہ داری جن کے کندھوں پر، ان کے لئے اس قسم کی عام لغزشوں سے بچنا بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔ یہ وجہ تھی، جو حضرت عمرؓ اپنے ان جلیل القدر رفقاء کی ہر نقل و حرکت پر نگاہ رکھتے تھے ــــ سب سے پہلے، خود اپنے آپ پر، اور اس کے بعد ان عمالِ حکومت پر۔ صدرِ اوّل کے اسلامی نظام نے جو اس قدر ابد در کنار درخشندہ و تابندہ و تابناک، انسانیت ساز، نتائج پیدا کئے تھے تو اس کی وجہ، قوانینِ حکومت کے مبنی برحق ہونے کے علاوہ، اعیان و ارکانِ حکومت کی پاکیزگیٔ سیرت اور بلندیٔ کردار بھی تھی اور یہی وجہ تھی جو حضرت عمرؓ ان کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔

عمالِ حکومت کے انتخاب کا معیار

قرآن کریم چونکہ اس نظام کا نقطۂ پرکار تھا، اس لئے عمال کے انتخاب میں، قرآنی علم کو بنیادی خصوصیت قرار دیا جاتا تھا۔ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) مکہ کے گورنر، نافع بن عمر بن عبد الحارث آپ سے ملے تو آپ نے پوچھا کہ تم نے اہلِ وادی پر کسے حاکم مقرر کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ عبد الرحمٰن بن ابزی کو۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ (سابقہ) غلاموں میں سے ایک غلام ہے۔ پوچھا کہ اُسے کس خصوصیت کی بنا پر حاکم مقرر کیا ہے۔ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ اس کی قرآن پر گہری نگاہ ہے اور فرائضِ دین کا علم حاصل ہے۔ اس پر آپ خوش ہوئے۔

(۲) اس واقعہ کو پھر سے سامنے لائیے جس میں ایک شخص نے کہا تھا کہ فلاں آدمی بڑا قابلِ اعتماد ہے تو آپ نے پوچھا تھا کہ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو؟ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے؟ یا کیا تم نے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کیا ہے؟ اور جب اس نے ان سوالات کا جواب نفی میں دیا تھا تو آپ نے کہا تھا کہ پھر تمہیں اس شخص کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں۔ تم نے اسے مسجد میں اُٹھتے بیٹھتے (نماز پڑھتے) دیکھ لیا اور یہ رائے قائم کر لی کہ وہ بڑا قابلِ اعتماد ہے۔

حسنِ معاملات

یہی معیار آپ عمالِ حکومت کے انتخاب کے سلسلہ میں اختیار فرماتے تھے۔ وہ کسی کے نماز روزے کو نہیں دیکھتے تھے بلکہ منصبِ متعلقہ کے لئے اس کی صلاحیت اور حسنِ معاملات کو دیکھتے تھے۔ اور ان صلاحیتوں میں جو بھی سب سے آگے

ہوتا اسے منتخب کرتے تھے، اور اس باب میں کسی کی رُو رعایت نہیں کرتے تھے۔ آپ اکثر کہا کرتے تھے کہ "میں کبھی پسند نہیں کرتا کہ کسی ایسے شخص کو گورنر مقرر کر دوں جس سے اعلیٰ صلاحیتوں کا حامل کوئی دوسرا شخص موجود ہو"۔

(۳) انتخاب کے لئے آپ کے اصولوں میں سے ایک اصول ملاحظہ فرمائیے اور پھر آپ خود ہی اندازہ لگائیے کہ آپ جس شخص کو منتخب کرتے تھے وہ کس سیرت و کردار کا حامل ہوتا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں سیادت (اعلیٰ منصب) کے لئے ایسے شخص کو منتخب کرنا پسند کرتا ہوں کہ

ایک بلند اصول

جب وہ اس منصب پر فائز نہ ہو تو اپنی قوم کا سردار نظر آئے۔ اور جب اُسے قوم کا سردار بنا دیا جائے تو وہ انہی میں کا ایک فرد معلوم ہو۔

کہئے! اس معیار کو دیکھ کر آپ کی نگہِ بصیرت وجد میں آگئی ہے یا نہیں!

(۴) آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ

خدا خائن کی قوت اور ثقہ انسان کے عجز (کمزوری) سے بچائے۔

ثقاہت اور قوت

یعنی قوتوں اور صلاحیتوں کا مالک انسان اگر خائن ہے تو وہ بھی خطرناک ہے۔ اور ایک شخص نہایت دیانت دار اور قابل اعتماد ہے لیکن ہے کمزور تو وہ بھی معزت رساں ہے۔ لہٰذا، انتخاب کا اصول تھا، ثقاہت اور قوت۔

(۵) لیکن "قوت" سے مراد سنگدلی اور شقاوتِ قلبی نہیں تھی۔ عدل کے لئے جرأت و بسالت تھی۔ آپ نے ایک دفعہ ایک شخص کو گورنری کے لئے منتخب کیا۔ اس کی تعیناتی کا پروانہ لکھا رہے تھے کہ ایک بچہ آیا۔ آپ کی گود میں بیٹھ گیا اور آپ نے اسے پیار کیا۔ اس (منتخب شدہ شخص) نے کہا کہ امیر المومنین! میرے دس بچے ہیں مگر کوئی میرے پاس نہیں پھٹک سکتا۔ آپ نے کہا۔ کہ اس میں میرا کیا قصور؟ اگر خدا نے تیرے دل سے رحم نکال لیا ہے تو میں کیا کروں؟ اس سے یہ کہا اور کاتب سے کہا کہ دستاویز پھاڑ دو۔ جو شخص اپنی اولاد کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش نہیں آتا وہ رعایا پر کیسے رحم کرے گا۔

شفقت اور محبت

(۶) کسی صوبے کی گورنری کے لئے ایک شخص آپ کے ذہن میں تھا لیکن اس نے ایک دن آکر آپ سے کہا کہ مجھے گورنر تعینات کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ میں تجھے ہی گورنر بنانے والا تھا، لیکن اب نہیں بناؤں گا، کیونکہ جو شخص خود کسی عہدہ کا خواہش مند ہو، اُسے اس عہدہ پر فائز نہیں کرنا چاہیئے۔

طلب گار کو نہیں

(۷) آپ نے نعمان بن عدی کو ایک صوبہ کا گورنر مقرر کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کے کچھ اشعار آپ کے سامنے آئے جن میں اس نے شاہد و شراب کی وجد آور کیفیات بیان کی تھیں۔ آپ نے اُسے بلا کر پوچھا تو اس نے کہا کہ امیر المومنین! بخدا میں نے آج تک کبھی

شاعر یا عہدہ

شراب کو چکھا تک نہیں۔ یہ تو محض شاعری ہے۔ آپ نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے۔ میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں تو شاعر تو بہت اچھا ہے لیکن گورنری کے قابل نہیں۔ اس لئے تجھے معزول کیا جاتا ہے۔ (یہ حضرت عمرؓ کے اپنے قبیلے کا آدمی تھا)۔

اشخاص پرستی کے خلاف

(۸) صحابہؓ میں سے جو لوگ زیادہ صاحبِ اثر تھے آپ انہیں اپنے پاس رکھتے تھے۔ مدینہ سے باہر نہیں جانے دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے پوچھا کہ آپ ہم لوگوں کو باہر کیوں نہیں جانے دیتے؟ آپ نے فرمایا کہ "اس سوال کا جواب نہ دینا، جواب دینے سے بہتر ہے"۔

اور وجہ ظاہر ہے کہ یہ حضرات باہر جاتے تو نو مسلموں میں شخصیت پرستی شروع ہو جاتی۔

اپنے بیٹے کو گورنر نہیں بنایا

(۹) اہلِ کوفہ کی طرف سے آپ ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ اگر وہاں کسی نرم مزاج آدمی کو گورنر بنا کر بھیجا جاتا تو وہ اُسے خاطر میں نہ لاتے۔ اگر وہ سخت مزاج ہوتا تو اس کی شکایتیں کرتے۔ ایک مرتبہ آپ نے تنگ آکر کہا کہ اگر مجھے کوئی ایسا آدمی مل جائے جو نہایت قوی بھی ہو اور امین بھی تو میں اسے وہاں کا گورنر مقرر کر دوں۔ ایک شخص پاس بیٹھا تھا۔ اس نے کہا کہ میں آپ کو ایسا آدمی بتاتا ہوں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ اس نے کہا کہ

عبداللہ ابن عمرؓ (یعنی خود آپ کے صاحبزادہ)۔

یہ سُن کر آپ نے فرمایا کہ "خدا تجھے غارت کرے!" (اس سے زیادہ اور کیا کہوں!)۔

اس قدر احتیاط کے بعد آپ عمالِ حکومت کا تقرر کرتے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ کسی شخص کے تقرر کے بعد آپ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے۔ آپ ان میں سے ہر ایک پر کڑی نگاہ رکھتے (اس کی تفصیل چند سطور آگے چل کر ملے گی) اور کسی کے متعلق کوئی شکایت سنتے تو اُسے وہاں سے تبدیل کر دیتے۔

تبادلے

اور شکایت کے درست ثابت ہونے پر اُسے معزول کر دیتے۔ آپ کا مقولہ تھا کہ

"اگر کوئی حاکم کسی جگہ کوئی زیادتی کرتا ہے اور میں اُسے، اس کا علم ہو جانے کے بعد بھی وہاں سے تبدیل نہیں کرتا تو یہ سمجھئے کہ وہ ظلم و زیادتی گویا خود میں نے کی ہے"۔

فرمایا:-

"کیا تم لوگوں کا خیال ہے کہ اگر میں کسی ایسے شخص کو گورنر تعینات کر دوں جو میرے خیال میں تم سب سے بہتر ہو۔ پھر اُسے انصاف کرنے کی تاکید بھی کر دوں، تو کیا میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جاؤں گا؟"

لوگوں نے کہا کہ ہاں!

آپ نے فرمایا:-

نہیں! جب تک میں یہ نہ دیکھ لوں کہ وہ میری ہدایات کے مطابق کام بھی کر رہا ہے یا نہیں میں

اس وقت تک اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتا "۔

---(٭)---

(۴) ہدایات

عمال کی تعیناتی کے وقت، اور اس کے بعد بھی، وقتاً فوقتاً آپ جو ہدایات دیتے اور نافذ کرتے رہتے تھے، ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ انہیں کس سیرت و کردار کا حامل، اور امورِ مملکت کو کن خطوط پر سرانجام پاتے دیکھنا چاہتے تھے۔ (مثلاً)

(۱) آپ جب کسی کو گورنر بنا کر بھیجتے تو فرماتے :۔

یاد رکھو! میں تم لوگوں کو مستبد اور ظالم بنا کر نہیں بھیج رہا، بلکہ رعایا کا راہ نما (امام) بنا کر بھیج رہا ہوں کبھی کسی بے قصور کو نہ مارنا کہ وہ ذلیل ہو جائے اور کبھی کسی کی بے جا تعریف نہ کرنا کہ وہ پھیل جائے۔ لوگوں کے کاموں میں رکاوٹ پیدا کرنے کے بجائے سہولتیں مہیا کرنا۔

(۲) آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو لکھا :۔

اپنی مجلس میں لوگوں کو مساوی درجہ دو تاکہ کمزور آدمی تمہارے عدل سے نا امید نہ ہو جائے اور صاحبِ منصب اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

(۳) جب کسی حاکم کے متعلق شکایت کی جاتی کہ وہ مریضوں کی عیادت کے لئے نہیں جاتا اور صاحبِ احتیاج کے پاس آنے سے گھبراتے ہیں تو آپ اُسے برطرف کر دیتے۔

(۴) حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ کے نام ایک خط میں لکھا :۔

یاد رکھو! لوگوں کے معاملات وہی سنوار سکتے ہیں جن کا عزم راسخ ہو اور وہ کسی سے دھوکا نہ کھائیں۔

نہ دھوکا دیتا ہے نہ دھوکا کھاتا ہے

ضمناً، ایک دفعہ ایک شخص نے کہا کہ مومن کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ آپ نے فرمایا کہ بات مکمل کرو۔ مومن نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے، نہ دھوکا کھاتا ہے۔

(۵) ہر عامل سے عہد لیا جاتا تھا کہ وہ (۱) ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہوگا (کہ اس میں رعونت اور نخوت پائی جاتی ہے (۲) باریک کپڑے نہیں پہنے گا۔ (۳) چھنا ہوا آٹا نہیں کھائے گا۔ (۴) اپنے دروازے پر دربان نہیں بٹھائے گا۔ (۵) اہلِ حاجت کے لئے اپنا دروازہ کھلا رکھے گا۔ یہ شرائط تقرری کے پروانے میں درج کر دی جاتی تھیں اور انہیں مجمع عام میں پڑھ کر بھی سُنا دیا جاتا۔

(۶) آپ نے ایک دفعہ اپنے عمال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا :۔

یاد رکھو! رعیت اس وقت تک امام کی پیروی کرتی ہے جب تک وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے جب

وہ احکام خداوندی سے سرکشی برتتا ہے تو رعایا اس کے احکام سے سرکشی اختیار کر لیتی ہے۔ جب وہ فسق و فجور اختیار کر لیتا ہے تو رعایا اس سے بڑھ کر فاسق و فاجر ہو جاتی ہے۔

(۷) ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کی اور حضرت عثمانؓ کی دعوت کی۔ جب وہاں سے واپس آئے تو آپ نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ کاش! میں یہ دعوت قبول نہ کرتا۔ انہوں نے پوچھا کہ کیوں؟ فرمایا "مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ دعوت اس لئے نہ کی گئی ہو کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ دیکھو! میں کتنا بڑا آدمی ہوں جس کے گھر اتنے اتنے بڑے لوگ کھانے کے لئے آتے ہیں۔" اسی بنا پر وہ عمالِ حکومت کو بھی دعوتیں قبول کرنے سے روکا کرتے تھے۔

(۸) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو ایک مراسلہ میں لکھتے ہیں کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ کسی جھگڑے میں

عصبیّت جاہلیہ کے خلاف

قبیلہ ضنبہ نے اپنے امیر کی طرف رجوع کرنے کے بجائے، آلِ ضنبہ (اپنے قبیلہ) کو مدد کے لئے پکارا تھا۔ یاد رکھو! جب کوئی شخص اپنے قبیلے کو آواز دے تو سمجھ لو کہ وہ شیطان کی آواز ہے۔ اس سے عہدِ جاہلیت کی قبائلی عصبیت جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا، پھر سے بیدار ہو جائے گی۔ اس رجحان کو سختی سے روکو۔ اب اگر وہ ایسا کریں تو وہی ہونگے۔ ظالم (زیادتی کرنے والا) اور مظلوم۔ اور مظلوم صرف امیر کو مدد کے لئے پکارے گا۔

(۹) حضرت عمرو بن عاصؓ کو ایک خط میں لکھا ۔۔۔ اور غور سے سنئے کہ کیا لکھا ۔۔۔ لکھا کہ

تم اپنی رعایا کے لئے ایسے بن جاؤ جیسے تم اگر رعایا ہو تو چاہو کہ تمہارا امیر ایسا ہو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم مجلس میں تکیہ لگا کر بیٹھتے ہو۔ ایسا ہرگز نہ کرو۔ عام لوگوں کی طرح بیٹھا کرو۔

(۱۰) آپ نے سپہ سالاروں کو ہدایت دے رکھی تھی کہ جنگ کے دوران کسی کو سزا نہ دو، مبادا وہ دشمن کے ساتھ جا ملے۔

(۱۱) حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو (جب وہ بصرہ کے گورنر تھے) لکھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم عوام کے ہجوم کو ایک ساتھ بلا لیتے ہو۔ مساوات، بے شک اپنی جگہ ہے لیکن اہلِ علم و دیانت کی قدر افزائی بھی ضروری ہے۔ اس لئے قرآن دان اور صاحبِ دیانت لوگوں کو پہلے بلا لیا کرو۔ (ایسا کرنا ان حضرات کی قدر افزائی کے علاوہ دوسروں کے دل میں قرآن دانی اور دیانت کا شوق پیدا کرے گا۔)

(۱۲) ایک اور قول سنیئے اور جھوم جائیے۔ فرمایا:۔

نرمی بلا ضعف ۔ سختی بلا جبر

وہی حکومت درست رہ سکتی ہے جس میں نرمی ہو، لیکن کمزوری کی وجہ سے نہیں۔ اور جس میں سختی ہو، لیکن استبداد کی بنا پر نہیں ۔۔۔ بلا ضعف نرمی، اور بلا جبر قوت ۔۔۔ یہ ہے اصل الاصول۔

(۱۳) حضرت مغیرہؓ کو کوفہ کا گورنر بنایا تو کہا کہ

مغیرہؓ! ایسا بن کر رہنا کہ پُرامن تجھ سے بے خوف رہیں، اور بد معاش خوف زدہ۔

(۱۴) ایک اور وجد آفریں قول ۔۔۔ فرماتے ہیں:۔

وجد آفریں قول

جو شر پیدا کر کے غالب آیا، وہ غالب نہیں مغلوب ہے۔
جس نے ناجائز طریقے سے کامیابی حاصل کی۔ وہ کامیاب نہیں، ناکام ہے۔

ایک دفعہ حضرت عمیر بن سعدؓ نے حمص میں منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں سے کہا کہ

جب تک اسلام میں حکومت کا زور ہے وہ ناقابلِ شکست رہے گا۔ لیکن حکومت کے زور کا مطلب تلوار سے قتل کرنا اور تازیانے مارنا نہیں بلکہ حق کے ساتھ فیصلہ اور انصاف کے ساتھ مؤاخذہ کرنا ہے۔

حضرت عمرؓ نے سنا تو فرمایا۔ اے کاش! عمیرؓ جیسا آدمی میرے قریب ہوتا تو میں اس سے مسلمانوں کے کتنے کام لیتا۔

(۱۵) ایک دفعہ عراق کا ایک وفد آیا جس میں حضرت احنف بن قیسؓ بھی تھے۔ سخت گرمی کا دن تھا۔ دیکھا کہ حضرت عمرؓ دھوپ میں کھڑے بیت المال کے ایک اونٹ کو تیل مل رہے ہیں اور اپنی قبا کو لپیٹ کر سر پر بطور عمامہ باندھ رکھا ہے۔ وفد کو دیکھا تو فرمایا!

احنفؓ! کپڑے اُتار کر آجا اور میری مدد کر۔ یہ بیت المال کا اونٹ ہے جس میں یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کا حق ہے۔

ایک شخص نے کہا۔ — امیرالمومنین! آپ کسی غلام (خادم) سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ یہ کام کر دے۔
آپ نے فرمایا کہ مجھ سے اور احنف سے بڑا غلام کون ہوگا۔

اور اس کے بعد وہ انقلاب آفریں فقرہ ارشاد فرمایا جس کے لیئے ہم نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ کہا!۔

غلام کی طرح مخلص اور امین

جو شخص مسلمانوں کا والی بنے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ غلام کی طرح مخلص اور امین رہے۔

(۱۶) عام مکتوب یہ تھی کہ :

کھردرے بنو اور عجمیوں کی طرح نازو انداز نہ کرو۔ اپنے آپ کو ان کے لباس سے بھی بچاؤ، کہ وہ تمہیں آرام طلب بنا دے گا۔ سخت بنو۔ جھوٹا موٹا کھاؤ۔ گاڑھا گزی پہنو۔ پرانے کپڑے استعمال کرو۔ سواریوں کو خوب فربہ کرو۔ ڈٹ کر گھوڑ سواری کرو۔ اور جم کر تیر اندازی کی مشق کرتے رہو، ہمیں تکلف سے منع کیا گیا ہے۔ اس لئے کبھی تکلف نہ کرو۔ دین میں تفقہ حاصل کرو۔ کتاب کے ظرف اور علم کے سرچشمے بنو۔ سیادت و قیادت حاصل کرنے کی خواہش ہے تو پہلے سمجھ پیدا کرو۔ جس میں تکبر دیکھو۔ سمجھ لو کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہے۔

(۱۷) اور آخر میں وہ ہدایت، جس میں تمام ہدایات سمو جاتی ہیں۔ فرمایا!۔

محاسبۂ خویش

اپنا محاسبہ آپ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے۔ کیوں کہ محاسبۂ خویش تمہارے حساب کتاب کو آسان کر دے گا۔

اپنے آپ کا وزن کرتے رہو قبل اس کے کہ تمہارے لئے میزان کھڑی کی جائے۔ اپنے آپ کو "عرض

اکبر (عدالت کی بڑی پیشی) کے لیے تیار رکھو جس دن تمہاری کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رہے گی۔

آئیے ـــ ہم دیکھیں کہ یہ محاسبہ کس طرح ہوا کرتا تھا۔ اپنا بھی اور دوسروں کا بھی۔

---

(۵) اِحتساب

احتساب کا پہلا قدم یہ تھا کہ ہر عامل کی تقرری کے وقت اس کے مقبوضات کی فہرست مرتب کر لی جاتی، اور اسے وقتاً فوقتاً چیک کرتے رہتے۔ اس کے ساتھ ہی التزام یہ تھا کہ ہر عامل کو اتنا دیا جائے جس سے اس کی اور اس کے متعلقین کی ضروریات باطمینان پوری ہوتی رہیں۔ (تفصیل اس کی معاشی نظام میں ملے گی)۔

مقبوضات کی فہرست

(۲) آپ نے احکام جاری کر رکھے تھے کہ کوئی گورنر مدینہ آئے تو دن کے وقت آئے اور لوگوں کے سامنے شہر میں داخل ہو۔ رات کے وقت نہ آئے۔

(۳) یہ احتساب مال تک محدود نہیں تھا۔ عمّال کے رہن سہن، طرزِ بود و ماند، تمدن و معاشرت اخلاقِ عامہ، غرضیکہ ان کی ہر نقل و حرکت پر آپ کی نگاہ رہتی تھی۔ مصر کے گورنر (حضرت) عیاض بن غنم کا واقعہ پہلے گذر چکا ہے۔ ان کے خلاف شکایت یہ تھی کہ وہ باریک کپڑے پہنتے ہیں، اور انہوں نے دربان مقرر کر رکھا ہے۔ شکایت کے صحیح ثابت ہونے پر آپ نے ان سے کہا کہ یہ لو، اُون کا جُبّہ پہنو۔ ایک عصا لو اور بیت المال کی تین سو بکریاں چراؤ تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ راعی (گڈریا) کی ذمہ داری کیا ہوتی ہے۔

راعی کی ذمہ داری

حمص کے گورنر (حضرت) عبداللہؓ بن قرط کے خلاف یہ شکایت تھی کہ انہوں نے اپنے رہنے کے لئے بالاخانہ بنوایا تھا۔ جس کی اجازت نہیں تھی۔ بالاخانہ کو تو آپ (حضرت عمرؓ) نے آگ لگوا دی اور گورنر کو ایک جبّہ پہنوا کر، ہاتھ میں ایک ڈول دیا اور کہا کہ بیت المال کے اونٹوں کو پانی پلایا کرو اس سے، دماغ سے تفاخر کی بُو نکل جائے گی۔

(۴) فاتح مصر حضرت عمرو بن عاصؓ کے بیٹے کا واقعہ پہلے گذر چکا ہے جس نے ایک قبطی کو بلا وجہ پیٹ دیا تھا۔ آپ نے اس قبطی کے ہاتھوں اُسے کوڑے لگوائے تھے۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ خود (حضرت) عمرو بن عاصؓ کے بھی ایک آدھ تازیانہ لگا دیا جائے جس نے اپنے بیٹے کی صحیح تربیت نہیں کی۔

(۵) شکایت سننے پر یونہی اندھا دھند مؤاخذہ نہیں کر لیا جاتا تھا۔ شکایت کی پوری پوری چھان بین کی جاتی اور جس کے خلاف شکایت ہوتی اُسے اپنی مدافعت کا موقعہ دیا جاتا۔ لوگوں نے حمص کے گورنر (حضرت) سعید بن عامرؓ کے خلاف چار شکایتیں کیں۔ (۱) دو دن چڑھے تک گھر سے نہیں نکلتے۔ (۲) رات کے وقت کسی کی پکار

مدافعت کا موقعہ دیا جاتا

نہیں سنتے۔ (۳) مہینہ میں ایک دن بالکل باہر نہیں آتے۔ اور (۴) کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے جیسے ان پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔

مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے سعید سے پوچھا کہ پہلی شکایت کا تمہارے پاس کیا جواب ہے۔ انہوں نے کہا۔ بخدا مجھے یہ پسند نہ تھا کہ میں اس بات کو عام کروں لیکن آپ پوچھتے ہیں تو مجھے بتانا ہی پڑے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میری بیوی کے پاس کوئی خادم نہیں۔ میں نے اس کا کچھ کام اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ صبح اٹھ کر آٹا گوندھتا ہوں اس کے خمیر ہونے تک انتظار کرتا ہوں۔ پھر روٹی پکاتا ہوں۔ ازاں بعد وضو کر کے باہر آتا ہوں۔

دوسری شکایت یہ تھی کہ رات کے وقت باہر نہیں آتے۔ آپ نے جواب میں کہا کہ میں یہ راز بھی سربستہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اب اسے بھی کھولنا پڑا۔ میں نے دن رعایا کے لئے اور رات اللہ کے لئے وقف کر رکھا ہے۔

تیسری شکایت یہ ہے کہ میں مہینے میں ایک دن باہر نہیں نکلتا۔ سو میرے پاس خادم نہیں جو میرے کپڑے دھوئے، نہ ہی کپڑوں کا کوئی فالتو جوڑا ہے۔ مہینے میں ایک دن کپڑے دھوتا ہوں اور ان کے خشک ہونے تک انتظار میں بیٹھا رہتا ہوں۔

اب رہا چوتھا الزام کہ مجھ پر کبھی کبھی سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔ تو یہ بات ذرا لمبی ہے۔ اس میں مجھے عمر رفتہ کو آواز دینی پڑے گی۔ مکہ میں مشرکین نے حضرت خبیبؓ انصاری کو گرفتار کر لیا اور ان کی بوٹیاں اڑا کر انہیں کھجور کے تنے کے ساتھ لٹکا دیا۔ اور پوچھا کہ کیا تو پسند کرتا ہے کہ اس وقت تیری جگہ محمدؐ ہوتا؟

انہوں نے جواب دیا کہ ملعونو! تم یہ کیا کہتے ہو۔ میں تو اسے بھی پسند نہیں کر سکتا کہ میں آرام سے رہوں اور حضورؐ کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھ جائے۔ اس پر قریش نے انہیں سخت اذیت دے کر صلیب دی۔

جب کبھی مجھے وہ دن یاد آجاتا ہے تو کانپ اٹھتا ہوں کہ خدا میرا یہ گناہ کبھی نہیں بخشے گا کہ میں نے اپنے سامنے یہ سب کچھ ہوتے دیکھا اور خبیبؓ کی کوئی مدد نہ کی۔ میں ان دنوں مشرک تھا۔ خدا پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ بایں ہمہ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ایک مظلوم کی مدد کرنی چاہئے تھی۔ جب اپنے اس گناہ کا احساس غالب آجاتا ہے تو مجھ پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔

یہ تھے اس دور کے گورنر۔ اور اس کے باوجود، سربراہ مملکت ان کی رفتار گفتار کردار پر کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ شکایتوں کی تحقیق و تفتیش سر عام (پبلک کے سامنے) ہوتی تھی، اور الزام

سر عام سزا

صحیح ثابت ہونے پر سزا بھی پبلک میں دی جاتی تھی۔ حضرت عمرو بن عاصؓ نے ایک دفعہ اس طریق کار کے خلاف احتجاج بھی کیا تھا اور کہا تھا کہ اس طرح عمالِ حکومت بددل ہو جائیں گے اور رعایا کی ان کے خلاف جرأتیں بڑھ جائیں گی۔ اس پر آپ نے فرمایا تھا کہ جو عامل انصاف کا تقاضا پورا کرنے پر بددل ہوتا ہے۔ وہ منصب حکومت کے قابل ہی نہیں۔ باقی رہا سزا کا پبلک میں دیئے جانا تو یہ

قرآن کریم کے ارشاد کے عین مطابق ہے جہاں اس نے کہا ہے کہ سزا پبلک میں دی جائے اور اس باب میں ذرا سی بھی نرمی نہ برتی جائے۔ (۲۴:۲)

آپ عمالِ حکومت کے بارے میں اس قدر سختی کیوں برتتے تھے، اس کی وجہ بھی آپ نے بیان فرما دی تھی۔ ایک دفعہ آپ نے دیکھا کہ حضرت طلحہؓ طواف میں رنگا ہوا کپڑا پہنے تھے۔ آپ نے

تمہارا ہر عمل عوام کے لئے سند بن جاتا ہے

کہا کہ طلحہؓ! طواف میں رنگ دار کپڑا، چہ معنی دارد؟ انہوں نے کہا کہ یہ تو مٹی کا رنگ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ طلحہؓ! دوسرے لوگوں کی نسبت آپ حضرات کو بہت زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ آپ لوگوں کے امام ہیں جن کی اقتداء عوام کرتے ہیں۔ اگر کوئی جاہل آپ کو دیکھے گا تو وہ اپنے لوگوں سے کہے گا کہ میں نے حضرت طلحہؓ کو بحالت طواف رنگ دار کپڑا پہنے دیکھا تھا۔ یوں تمہارا یہ معصوم سا عمل لوگوں کے لئے سند بن جائے گا۔ لہٰذا ہم لوگوں کو بڑی احتیاط برتنی چاہیے۔

اور یہی وجہ تھی کہ آپ ان ذمہ دار حضرات کا چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی مؤاخذہ کرتے تھے۔

لیکن دوسروں کا محاسبہ اور مؤاخذہ کرنے سے پہلے، امیر المؤمنین خود اپنا محاسبہ کرتے، اور اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے مؤاخذہ کے لئے پیش کرتے تھے۔ واقعہ مشہور ہے کہ یمنی چادریں آئیں تو آپ نے سب کو ایک ایک چادر دے دی۔ ایک دن آپ منبر پر تشریف لائے اور حسب معمول مجمع سے کہا کہ — اسمعوا واطیعوا "جو کچھ میں کہتا ہوں اسے سنو اور پھر اس کی اطاعت کرو"

خود اپنا محاسبہ

یمنی چادریں

مجمع میں سے آواز آئی — "ہم نہ تمہاری سنیں گے، نہ اطاعت کریں گے" کہنے والے حضرت سلمان فارسیؓ تھے۔ سربراہِ مملکت منبر سے نیچے اتر آئے اور کہا کہ ابو عبد اللہ! کیا بات ہے؟"

کہا۔ عمرؓ! تم نے دنیا داری برتی ہے۔ تم نے ایک ایک چادر تقسیم کی تھی، اور خود دو چادریں پہن کر آئے ہوا!"

فرمایا۔ عبد اللہ بن عمرؓ کہاں ہے؟

حاضر ہوں! امیر المؤمنین!

فرمایا۔ بتاؤ۔ ان میں سے ایک چادر کس کی ہے — عرض کیا میری ہے۔ امیر المؤمنین!

آپ نے حضرت سلمانؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ابو عبد اللہ! تم نے جلدی کی جو بات پوچھے بغیر احتجاج کر دیا میں نے اپنے پہلے کپڑے دھوئے تھے۔ باہر آنے کے لئے ایک چادر کافی نہیں تھی۔ اس لئے میں نے (اپنے بیٹے) عبد اللہ سے چادر مانگ لی تھی۔

(حضرت) سلمانؓ نے کہا۔ ہاں! اب کہئے۔ یا امیر المؤمنین! ہم سنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے

آپ خود اپنا یہ قول کیسے بھول سکتے تھے کہ

رعیت اس وقت تک امیر کی اطاعت کرتی ہے جب تک وہ خدا کی اطاعت کرتا رہے۔

ایک درہم

حضرت معیقیبؓ بیت المال کے خزانچی تھے۔ ایک دن بیت المال میں جھاڑو دینے لگے۔ تو کوڑے میں سے ایک درہم (اُس وقت کا کم از کم سکہ) ہاتھ لگا۔ اتفاق سے حضرت عمرؓ کے گھر کا ایک بچہ پاس کھڑا تھا۔ خزانچی نے وہ درہم اس بچے کو دے دیا اور گھر چلا گیا۔ ابھی گھر پر پہنچا ہی تھا کہ امیر المومنین کا بلاوا آگیا۔ وہ آیا تو دیکھا کہ وہی درہم آپ کے ہاتھ میں تھا۔ کہا کہ معیقیبؓ! میں نے تمہارے ساتھ کون سی زیادتی کی تھی جو تم نے مجھ سے اس طرح بدلہ لینا چاہا؟ تم سوچو کہ قیامت کے دن جب امتِ محمدیہ مجھ سے اس درہم کی بابت پوچھے گی تو میں کیا جواب دوں گا۔

عمرؓ! خدا سے ڈر

ایک شخص نے آپ سے بھرے مجمع میں کہا کہ عمرؓ! خدا سے ڈر۔ وہ بار بار اس جملہ کو دہراتے چلا گیا۔ تو مجمع میں سے ایک شخص نے اس سے کہا کہ اب بس بھی کرو، تم بہت کہہ چکے۔ حضرت عمرؓ نے اسے روکا اور کہا کہ نہیں! اسے کہنے دو۔ اگر لوگ ایسی بات نہ کہیں تو سمجھ لو کہ ان میں خیر کا ذرہ تک نہیں رہا۔ اور اگر ہم اسے نہ سُنیں تو سمجھ لو کہ ہم میں خیر کی رمق تک نہیں رہی۔

خلیفہ ٹھیک نہ چلے تو

ایک دن آپ نے برسرِ منبر کہا کہ صاحبو! اگر میں دنیا کی طرف جھک جاؤں تو تم کیا کرو گے؟ ایک شخص کھڑا ہو گیا۔ تلوار نیام سے نکالی اور کہا کہ ہم تمہارا سر اُڑا دیں گے۔ آپ نے اسے آزمانے کے لئے کہا کہ "کیا تو میری شان میں یہ بات کہتا ہے؟" اس نے نہایت سکون سے کہا کہ ہاں! تمہاری شان میں۔ آپ نے فرمایا کہ الحمدللہ! قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ اگر عمرؓ بھی کج رَو ہو جائے تو وہ اس کا سر اڑا دیں۔

اور یہ "سر اڑا دینے کی بات" تو خود آپ ہی نے انہیں بتائی تھی۔ ایک دفعہ آپ نے کہا کہ اگر خلیفہ ٹھیک ٹھیک چلے تو لوگوں کو چاہئے کہ اس کی اطاعت کریں، لیکن اگر وہ غلط راستہ اختیار کرے تو اسے قتل کر دینا چاہیئے۔

حضرت طلحہؓ پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے یہ کیوں نہ کہا کہ اگر خلیفہ ٹھیک نہ چلے تو اسے معزول کر دینا چاہیئے۔ آپ نے فرمایا —— "نہیں! قتل کر دینا بعد میں آنے والوں کے لئے زیادہ عبرت ناک ہوگا۔"

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلامی نظام میں ہر شخص کو اس کا حق حاصل ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنی دانست میں سمجھے کہ خلیفہ غلطی کر رہا ہے تو وہ اٹھ کر اس کا سر اڑا دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن جرائم کی سزا موت ہے اگر وہ خلیفہ سے بھی سرزد ہوں تو اسے بھی وہی سزا دینی چاہیئے۔ اس باب میں سربراہِ مملکت اور عام لوگوں میں فرق نہیں کرنا چاہیئے۔

لیکن حضرت عمرؓ یہ بھی جانتے تھے کہ سربراہِ مملکت کا احتساب اس کی ذات تک محدود نہیں ہونا چاہیے

اہل و عیال کا احتساب

اس میں اس کے اہل و عیال بھی برابر کے شریک ہونے چاہئیں۔ قرآن کریم نے جو بعض بیوی بچوں کو انسان کا دشمن (۶۴/۱۴) اور مال اور اولاد کو فتنہ (۸/۲۸) کہا ہے تو یہ خطرناک گھاٹی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھی۔ چنانچہ آپ کا دستور تھا کہ

جب لوگوں کو کسی بات سے منع کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے ان سے کہتے کہ میں نے لوگوں کو فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ یاد رکھو: لوگ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جس طرح پرندہ گوشت کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر تم بچو گے تو وہ بھی بچیں گے۔ اور اگر تم پھنسو گے تو وہ بھی پھنسیں گے۔ اگر تم میں سے کسی شخص نے ان باتوں کا ارتکاب کیا تو خدا کی قسم! میں اپنے ساتھ تمہارے تعلق کی وجہ سے تمہیں دگنی سزا دوں گا۔ اب تمہیں اختیار ہے، جو چاہے حدود سے تجاوز کرے، جو چاہے ان کے اندر رہے۔

اور یہ "دگنی سزا" کا فیصلہ قرآن کریم کے اس ارشاد کے مطابق تھا جس میں نبی اکرمؐ کی ازواج مطہراتؓ سے کہا گیا تھا کہ یاد رکھو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ تم میں سے جو کسی جرم کی مرتکب ہوگی اسے دگنی سزا ملے گی (۳۳/۳۰) حضرت عمرؓ نے اپنے ارشادِ گرامی سے اس نکتہ کی وضاحت کر دی کہ قرآن کا وہ حکم مملکت اسلامیہ کے ہر سربراہ پر یکساں عاید ہوتا ہے۔

یہ تھا مملکت کی ذمہ داریوں کا احساس جس کے پیشِ نظر آپ نے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) مصر کے قاصد (حضرت) معاویہ بن خدیج رضؓ سے کہا تھا کہ تم نے خیال کیا کہ دوپہر کا وقت ہے۔ امیر المومنین

ذمہ دار کو نیند کہاں؟

اس وقت قیلولہ فرما رہے ہوں گے۔ معاویہؓ! جس کے ذمے مملکت کے فرائض ہوں، اُن تو ایک طرف اسے رات کے وقت بھی نیند نہیں آ سکتی۔

ذمہ داریوں کا احساس

اسی ذمہ داری کا احساس تھا جس پر نگاہ رکھتے ہوئے حضرت عباسؓ نے اس شخص کے سوال پر کہ حضرت عمرؓ کیسے تھے۔ جواب میں کہا تھا کہ:

وہ اس خوف زدہ پرندے کے مانند تھے جسے ہر طرف جال ہی جال نظر آ رہے ہوں۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک سفر میں میں حضرت عمرؓ کے ساتھ تھا۔ وہ راستہ میں ایک احاطہ کے اندر داخل ہو گئے۔ میں نے پس دیوار کان لگا کر سنا تو آپ کہہ رہے تھے:

خطاب کا بیٹا عمر اور امیر المومنینؓ! اللہ اکبر! خطاب کے بچو کرے۔ اللہ سے ڈرتا رہ۔ ورنہ وہ تجھے ہلاک کر دے گا۔

ایک دن آپ نے اعلان کیا کہ "الصلوٰۃ جامعہ" لوگوں نے حسبِ معمول سمجھا کہ کوئی اہم معاملہ درپیش ہے جس کے لئے اجتماعی اعلان ہوا ہے۔ وہ جمع ہوئے تو آپ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا:

اے لوگو! میں اپنی مخزومی خالاؤں کے اونٹ چرایا کرتا تھا اور ان کا پانی بھرا کرتا تھا جس کے عوض وہ مجھے مٹھی بھر چھوہارے دے دیا کرتی تھیں۔

یہ کہہ کر آپ منبر سے اتر آئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ امیرالمومنین! ہم سمجھے نہیں کہ اس اجتماع اور اعلان کا مطلب کیا تھا؟ فرمایا۔ آج میں تنہا بیٹھا تھا کہ دل نے کہا کہ تو امیرالمومنین ہے۔ تیرے اور اللہ کے درمیان کوئی قوت نہیں۔ تجھ سے افضل کون ہو سکتا ہے۔ اس پر میں کانپ اٹھا اور کہا کہ ضروری ہو گیا ہے کہ میں اپنے نفس کو بتا دوں کہ وہ ہے کیا؟ اس اجتماع اور خطاب سے یہی مقصد تھا۔

ایک دن حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ بیت المال کے اونٹوں کا جائزہ لینے کے لئے گئے۔ حضرت عمرؓ اونٹوں کو دیکھ دیکھ کر ان کے احوال و کوائف بولتے جاتے تھے۔ حضرت علیؓ سن سن کر حضرت عثمانؓ کو املا کراتے جاتے تھے اور وہ انہیں (ایک) درخت کے نیچے بیٹھے لکھتے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ دھوپ میں کھڑے تھے۔ دھوپ سخت تھی لیکن وہ کام میں ایسے منہمک تھے کہ انہیں اس کی شدت کا قطعاً احساس نہیں تھا۔ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ نے قرآن مجید میں حضرت شعیبؑ کی بیٹی کا یہ قول پڑھا ہو گا جس نے کہا تھا کہ يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ (۲۸/۲۶) "ابا جان! اسے (حضرت موسیٰؑ کو) ملازم رکھ لیجئے کیوں کہ بہترین خدمت گزار وہ ہے جو قوی بھی ہو اور امین بھی"۔ حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یہ ہے قوی الامین۔

اَلْقَوِیُّ الْاَمِیْن

اَلْقَوِیُّ الْاَمِیْن - ان دو لفظوں میں حضرت عمرؓ کی ساری شخصیت سمٹ کر آجاتی ہے۔

اُس دور کے عمّالِ حکومت جو اس قدر امین تھے تو اس کا راز بھی اسی میں تھا کہ سربراہِ مملکت خود امین تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مدائن کی فتح کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے مالِ غنیمت مدینہ بھیجا۔ تو زر و جواہرات کی اس قدر کثرت اور نوادرات کے ایسے تنوع کو دیکھ کر اہلِ مدینہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ حضرت سعدؓ نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ امیرالمومنین! یہ مال و متاع اس قدر وجہِ تعجب اور باعثِ مسرت نہیں جس قدر یہ امر کہ جب ہم نے یہ شہر فتح کئے ہیں تو یہ تمام زر و جواہرات آپ کی فوج کے سپاہیوں کے سامنے پڑے تھے اور کوئی باہر کا دیکھنے والا بھی نہیں تھا لیکن ان میں سے کسی نے ایک سوئی تک بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ سارے کا سارا مال لا کر مرکز میں ڈھیر کر دیا۔ یہ پڑھ کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بہہ گئے۔ حضرت علیؓ پاس کھڑے تھے۔ فرمایا کہ:-

جیسا سربراہ ویسے عُمّال

ابن خطاب! تمہارے سپاہی اس لئے امین ہیں کہ تم امین ہو۔

یہ تھا سارا راز اس دور کی حکومت کی درخشندگی اور تابندگی کا ـــــ اس دور میں سربراہِ مملکت کا فریضہ، مملکت کے انتظام کی درستگی ہی نہیں تھا۔ اس کا فریضہ حکومت کے اعضاء و جوارح کی سیرت و کردار کی درستگی بھی تھا ـــــ بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ اس کا اوّلین فریضہ ارکانِ حکومت کی سیرت و کردار کی درستگی تھا۔ انتظام کی درستگی، ان کی سیرت کی درستگی کا فطری نتیجہ تھا۔

"سمیع و بصیر"

اور اس حسنِ عمل اور درستگیٔ نظم و نسق کا راز یہ تھا کہ سربراہِ مملکت تمام رعایا کے حالات سے باخبر رہتا تھا۔ ایک شخص نے آپ کے ایک پڑوسی سے دریافت کیا کہ امیرالمومنین تک پہنچنے کی کیا سبیل ہے؟

ہر ایک کی رسائی

اس نے کہا کہ نہ تو ان کے گھر پر کوئی پھاٹک ہے، نہ وہ پس پردہ بیٹھتے ہیں۔ وہ نماز پڑھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر جو چاہتا ہے ان سے باتیں کرنے تک جاتا ہے۔

یہ تو رہا رعایا کا امیرالمومنین تک پہنچنا۔ لیکن امیرالمومنین خود رعایا تک پہنچا تھا۔ وہ بازاروں میں پھرتے، رعایا کے معاملات کا خود مشاہدہ اور مطالعہ کرتے۔ ضروری امور کا فیصلہ وہیں برسرِ موقعہ کر دیتے زیادہ اہم معاملات مجلسِ مشاورت میں پیش کر دیتے۔ دن کے وقت فرصت کم ملتی تو راتوں کو گشت کرتے اور بغیر کسی کو علم ہوئے، رعایا کے حالات براہِ راست معلوم کرتے کتبِ تاریخ میں اس گشت کے بڑے دلچسپ اور سبق آموز واقعات مذکور ہیں۔ (مثلاً) (۱) ایک دفعہ ایک قافلہ آیا اور شہر سے باہر اترا۔ اس کی خبرگیری کے لئے خود تشریف لے گئے۔ گشت لگاتے پھر رہے تھے کہ ایک طرف سے ایک شیرخوار بچے کے رونے کی آواز آئی۔ ادھر گئے اور اس کی ماں کو تاکید کی کہ وہ بچے کو بہلائے۔ تھوڑی دیر بعد پھر ادھر سے گزرے

بچہ رو رہا تھا

تو بچے کو روتے پایا۔ سخت غصّہ کے عالم میں اس کی ماں سے کہا کہ تم بڑی بےرحم ماں ہو۔ اس نے کہا کہ راہرو! تمہیں حقیقت کا علم نہیں اور مجھے خواہ مخواہ تنگ کرتے ہو۔ بات یہ ہے کہ عمرؓ نے حکم دے رکھا ہے کہ بچوں کا وظیفہ اس وقت سے شروع کیا جائے جب وہ دودھ چھوڑ دیں۔ میں اس کا دودھ چھڑاتی ہوں۔ اور یہ روتا ہے۔ یہ سُن کر حضرت عمرؓ کو سخت رقت ہوئی اور کہا کہ ہائے عمرؓ! نہ معلوم تو نے کتنے بچوں کا خون کیا ہوگا۔ اُسی دن منادی کرادی کہ بچوں کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔

(۲) آپ کے خادم اسلمؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ رات کے وقت گشت کو نکلے۔ شہر کے باہر ایک مقام پر دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے رو رہے ہیں حقیقتِ حال معلوم

خالی ہانڈی چڑھا رکھی تھی

کرنے پر اس نے کہا کہ تین وقت سے بچوں کو کچھ کھانے کو نہیں ملا۔ میں نے خالی ہانڈی میں پانی ڈال کر چولھے پر چڑھا رکھا ہے کہ بچوں کا دل بہلا رہے۔ حضرت عمرؓ اُٹھے۔ بیت المال سے آٹا گھی، کھجوریں لیں اور اسلمؓ سے کہا کہ انہیں میری پیٹھ پر لاد دو۔ اسلمؓ نے کہا کہ مجھے دیجئے۔ میں لئے جاتا ہوں۔ فرمایا کہ اسلمؓ! اس معاملہ کا تعلق قیامت سے ہے۔ اور قیامت میں تم میرا بوجھ نہیں اُٹھاؤ گے۔ اس لئے یہ بوجھ مجھے خود ہی اُٹھانے دو۔ یہ چیزیں لا کر اس عورت کو دیں۔ اس نے ہانڈی چڑھائی تو آپ چولھا پھونکتے رہے۔ کھانا تیار ہوا۔ بچوں نے سیر ہو کر کھایا اور

اچھلنے کودنے لگے۔ حضرت عمرؓ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ چلنے لگے تو اس عورت نے کہا کہ خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ امیر المومنین ہونے کے قابل تم تھے، نہ کہ عمرؓ!

فی الحقیقت امیر المومنین ہونے کے قابل یہی تھے۔

(۳) اسی طرح ایک رات گشت میں ایک بدو کے پاس، اس کے خیمے سے باہر بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ دفعتہً خیمہ سے رونے کی آواز آئی۔ آپ کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ میری بیوی دردِ زہ میں مبتلا ہے اور اس وقت کوئی عورت پاس نہیں۔ آپ خاموشی سے اُٹھے۔ گھر آئے۔ اپنی زوجہ محترمہ اُمّ کلثومؓ (حضرت علیؓ کی صاحب زادی تھیں) کو ساتھ لیا اور بدو کی اجازت سے انہیں خیمہ کے اندر بھیج دیا۔ اور خود باہر بدو سے باتیں کرنے لگ گئے۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس سے باتیں کر رہا ہے کہ اندر سے اُمّ کلثوم کی آواز آئی: "امیر المومنین! اپنے دوست کو بچے کی مبارک باد دیجئے۔"

بدو کی بیوی

امیر المومنین!! ــــ یہ سُن کر بدو کی جو حالت ہوئی ہوگی وہ ظاہر ہے۔ آپ نے اُسے مبارک باد دی اور فرمایا کہ کل میرے پاس آنا تاکہ اس بچے کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔

(۴) اور اسی گشت کی ایک شبِ تاریک میں آپ کو وہ گوہرِ تابدار مل گیا جس نے کاشانۂ فاروقیؓ کو بقعۂ نور بنا دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کو دودھ میں پانی ملانے سے منع کرتے تھے۔ ایک رات آپ گشت کرتے کرتے تھک گئے تو ایک مکان کے باہر اس کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سنا تو اندر ایک عورت اپنی لڑکی سے کہہ رہی تھی کہ اٹھو۔ اور دودھ میں تھوڑا سا پانی ڈال دو۔

دودھ میں پانی نہ ملانے والی لڑکی

اس نے کہا ــــ اماں! تمہیں معلوم نہیں کہ امیر المومنین نے دودھ میں پانی ملانے سے شدت سے منع کر رکھا ہے۔

ماں نے کہا ــــ اٹھو۔ اور دودھ میں پانی ڈال۔ اس جگہ کونسا امیر المومنین تمہیں دیکھ رہا ہے۔

بیٹی نے کہا ــــ اماں! امیر المومنین نہیں دیکھ رہا ــــ تو وہ خدا تو دیکھ رہا ہے جس کا حکم امیر المومنین ہم تک پہنچاتے ہیں۔

صبح ہوئی تو آپ نے اپنی بیوی سے کہا کہ جلدی سے جا اور دیکھ کر وہ لڑکی شادی شدہ ہے یا ابھی اس کی شادی ہونی ہے۔ اگر وہ غیر شادی شدہ ہے تو اُسے بہو بنا کر گھر لے آ کہ اس قسم کی نعمتیں روز روز نہیں ملا کرتیں ــــ معلوم ہوا کہ لڑکی بیوہ ہے آپ نے اپنے بیٹے عاصمؓ سے اس کی شادی کر دی۔

اسی لڑکی کی اولاد سے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ پیدا ہوئے تھے جنہوں نے خلافتِ راشدہ کی یاد تازہ کر دی تھی ... اسی نسبت سے آپ (حضرت عمرؓ) حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے نانا کہلاتے ہیں۔

(۵) ایک دفعہ لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے کہ دیکھا کہ ایک آدمی بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا ہے۔ اس سے کہا کہ میاں! دائیں ہاتھ سے کھانا کھاؤ۔ دوبارہ ادھر سے گزرے تو وہ پھر بھی بائیں ہاتھ ہی سے کھا رہا تھا۔

ذرا سختی سے کہا کہ دائیں ہاتھ سے کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ اس نے کہا کہ میرا دایاں ہاتھ کام آچکا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ کسی جہاد میں اس کا دایاں ہاتھ کٹ گیا تھا۔ حضرت عمرؓ اس کے پاس بیٹھ گئے۔ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ افسوس ہے تمہیں وضو کون کراتا ہوگا۔ سر کون دھوتا ہوگا۔ کپڑے کون پہناتا ہوگا۔ پھر ایک ملازم مقرر کر دیا کہ اس کے ضروری کام کر دیا کرے۔

یہ تھا رعایا کے افراد پر سربراہ کی نگاہ کا عالم!

(۶) اس عورت کے واقعہ میں جو خالی ہانڈی چولہے پر چڑھائے بھوکے بچوں کو بہلا رہی تھی، ہم نے ایک کڑی دانستہ چھوڑ دی تھی۔ جب آپ نے

ہمارا حاکم اور ہماری حالت سے بےخبر!

کہا تھا کہ بچوں کو تین دن سے کچھ کھانے کو نہیں ملا۔ تو آپ نے اس سے کہا تھا کہ تم نے امیر المومنین کو اس کی اطلاع دی تھی؟ اس کے جواب میں اُس نے جو کچھ کہا تھا اُس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ اس دور میں عام عورتوں تک، حکومت کی ذمہ داریوں کو کس حد تک جانتی تھیں۔ اُس نے کہا تھا کہ:

جو شخص حاکم ہو کر رعایا کے حالات سے بےخبر رہے، اُس تک شکایت پہنچانے سے کیا حاصل!

(۷) اور یہیں سے ہمارے سامنے وہ واقعہ آجاتا ہے کہ جب بھی عمرؓ اُسے یاد کرتے، آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ آپ شام کے سفر سے واپس آرہے تھے تو راستے میں ایک خیمہ دیکھا — ویرانے میں

شام کے ویرانے کی بڑھیا

ایک خیمہ! قریب گئے تو دیکھا کہ اس میں ایک بڑھیا بیٹھی ہے پوچھا کہ تمہیں کچھ عمرؓ کا بھی حال معلوم ہے؟ اس نے کہا کہ سنا ہے وہ شام سے چل پڑا ہے۔ اس سے زیادہ نہ مجھے اس کی بابت کچھ علم ہے، نہ معلوم کرنے کی ضرورت۔ آپ نے پوچھا کہ ایسا کیوں؟ اس نے کہا کہ جس نے آج تک یہ معلوم نہیں کیا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے، میں اس کے حالات معلوم کر کے کیا کروں گی؟ آپ نے کہا کہ تم نے عمرؓ تک اپنی حالت کی اطلاع پہنچائی تھی؟ اس نے کہا کہ یہ میرا کام نہیں تھا۔ عمرؓ کا کام تھا۔ آپ نے کہا کہ عمرؓ کو اتنی دور کا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں اس بڑھیا نے جو کچھ کہا وہ غور سے سننے کے قابل ہے۔ اس نے کہا کہ

اگر عمرؓ اپنی رعایا کے ہر فرد کے حالات کا علم نہیں رکھتا تو اُسے حکومت کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟

حضرت عمرؓ جب بھی اس واقعہ کو یاد کرتے تو آنکھوں میں آنسو آجاتے اور کہتے کہ خلافت کا مفہوم کیا ہے مجھے شام کی اس بڑھیا نے بتایا۔

خدا وندا! خدائی درد سر ہے۔

اسی کا احساس تھا کہ آپ نے ایک دفعہ فرمایا کہ

اگر میں زندہ رہا تو رعایا کا حال معلوم کرنے کے لئے سال بھر تک مسلسل سفر میں رہوں گا۔ کیوں کہ دُور دراز علاقوں کے لوگ مجھ تک پہنچ نہیں سکتے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے عمال، ان میں سے ہر ایک کی ضروریات سے مجھے آگاہ کرتے ہوں۔ میں شام، جزیرہ، مصر، بحرین، بصرہ، جاؤں گا اور ہر

> مقام پر دو دو ماہ قیام کرکے لوگوں کے حالات براہ راست معلوم کروں گا۔
> لیکن عمر نے ایفا نہ کی اور اس دورہ کا موقعہ ہی نہ ملا۔

(o)

ظاہر ہے کہ جب ان کی اپنی یہ حالت تھی تو اپنے عمال کو کس قدر سخت تاکید نہیں کرتے ہوں گے کہ وہ لوگوں کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ (حضرت) عیاض بن غنم رضؓ کو اس "جرم" کی پاداش میں کہ انہوں نے اپنے دروازے پر دربان بٹھا دیا تھا، کیسی عبرت آموز سزا دی تھی۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے مکان کے سامنے بازار تھا۔ جس سے ہر وقت شور و شغب کی آواز آتی رہتی تھی۔ آپ نے اس طرف کا دروازہ بند کر دیا۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپؓ نے محمد بن مسلمہؓ (انسپکٹر امور عامہ) کو بلا کر کوفہ روانہ کیا اور کہا کہ جا کر سعدؓ کے دروازے کو آگ لگا دے۔ اس سلسلہ میں آپ نے جو خط حضرت سعدؓ کو لکھا تھا اس میں کہا تھا کہ

> جس محل کے دروازے عوام پر بند ہو جائیں، وہ قصر سعدؓ نہیں، قصر فساد ہے۔ اس کا منہدم ہو جانا ہی بہتر ہے۔

آپ نے گورنروں کے نام تاکیدی احکام نافذ کر رکھے تھے کہ

> وہ پردوں کے پیچھے چھپ کر نہ بیٹھیں۔ عوام کے سامنے بیٹھیں۔ اپنا حق وصول کریں۔ ان کے حقوق کی ادائیگی کریں۔

حج کی تقریب پر شکایات

یہ تو سال بھر کا معمول تھا۔ اور سال کے بعد حج کا اجتماع ہوتا تھا جس میں لاکھوں افراد شریک ہوتے تھے۔ اس میں آپ تمام صوبوں کے گورنروں کو بلاتے۔ دوسری طرف ملک میں عام اعلان کیا جاتا کہ جسے کسی کے خلاف کوئی شکایت ہو وہ اس اجتماع میں آ جائے۔ وہاں شکایات سنی جاتیں۔ پیشی ہوتی۔ اور جس کے خلاف شکایت صحیح ثابت ہوتی اُسے لاکھوں کے اجتماع میں سزا دی جاتی یا سرزنش کی جاتی۔

(o)

یہ تھا امیر المومنین، حضرت عمر فاروق رضؓ کا رعایا کے حالات سے باخبر رہنے کا طریق اور معمول۔ سچ ہے۔ جو خدا کے سمیع و بصیر و خبیر کے نام پر لوگوں سے اطاعت لے، اسے خود ایسا ہی (بحد بشریت) سمیع و بصیر و خبیر ہونا چاہئے۔ یہی صحرائے شام کی اس بڑھیا نے کہا تھا کہ

> اگر عمرؓ کے پاس رعایا کے حالات سے باخبر رہنے کا انتظام نہیں تو اسے چاہئے کہ حکومت چھوڑ دے۔

ان مقامات پر، رہ رہ کر میرے جی میں آتا ہے کہ میں فاروق اعظمؓ کی اس بات کو بھی نوک قلم پر لے آؤں جس کے تصور سے رہگذر خیال روش صد بہار ہو جاتا ہے لیکن کوئی جذبہ ہے جو غیر شعوری طور پر یہ کہہ کر میرا ہاتھ روک لیتا ہے کہ ـــــ اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی!